اٰتیناہ الحکمۃ وفصل
الخطاب
ALL INDIA MUSLIM EDUCATIONAL CONFERENCE
SULTAN JAHAN MANZIL, ALIGARH
۱۹۱۴ء کی یادگار تقریر
مع
خطبہ صدارت
خان بہادر سر رحیم بخش
۲۸ واں سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی
پروفیسر محمد سلیمان اشرف

اٰتَیۡنٰهُ الۡحِکۡمَةَ وَفَصۡلَ الۡخِطَابِ

پروفیسر محمد سلیمان اشرف

۱۹۱۴ء کی یادگار تقریر

مع

خطبۂ صدارت: خان بہادر سر رحیم بخش

۲۸واں سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی

ادارۂ پاکستان شناسی لاہور

کتاب : الخطاب
تقریر : مولانا محمد سلیمان اشرف
خطبۂ صدارت : خان بہادر سر رحیم بخش
بار اوّل : علی گڑھ، ۱۹۱۵ء
طبع جدید : اکتوبر ۲۰۱۶ء
تقدیم و تحشیہ : ظہور الدین امرتسری
ترجمہ فارسی اشعار : ڈاکٹر معین نظامی
کمپوزنگ : محمد نعیم اصغر ۰۳۳۳-۴۴۷۴۹۵۹
ضخامت : ۱۸۸ صفحات
تعداد : گیارہ سو
مطبع : ایوب پرنٹنگ پریس، لاہور
ناشر : ادارۂ پاکستان شناسی، ۲/۲۴ سوڈھیوال کالونی، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۰۰
فون: ۰۳۲۲-۴۰۰۵۹۵۲
ہدیہ : ۳۵۰ (تین صد پچاس روپے)

ڈسٹری بیوٹرز

خان بک کمپنی: ۳ کورٹ اسٹریٹ، لوئر مال، لاہور فون: ۰۴۲-۳۷۳۲۵۴۶۳
ادبستان: ۶-سی دربار مارکیٹ، لاہور فون: ۰۳۰۰-۴۱۴۰۲۰۷
بیکن بکس: گلگشت، ملتان فون: ۰۶۱-۶۵۲۰۷۹۰-۹۱
دارالعلوم نعیمیہ: فیڈرل بی ایریا، دستگیر بلاک نمبر ۱۵، کراچی فون: ۰۲۱-۳۶۳۲۴۲۳۶

پہلی وحی اور علم

صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے علم و تعلیم پر ہر مذہب سے زیادہ زور دیا ہے۔حتیٰ کہ قرآن مجید کی پہلی وحی کا سب سے پہلا لفظ ''اِقْـــــرَاْ'' ہے،جس کے معنی ہیں پڑھو۔یعنی قرآن مجید سب سے پہلے پڑھنے ہی کا حکم دیتا ہے۔پڑھنے کے علاوہ لکھنے کو بھی بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے، چناں چہ اسی اولین وحی میں اللہ کے مقدس اوصاف کا علم عطا فرماتے ہوئے کہتا ہے:

اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o	پڑھو،اور تمہارا رب بے حد کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم عطا فرمایا ہے۔

قلم اور لکھنے کی راہ سے علم کی اشاعت اسلام کی نگاہ میں اس قدر اہم ہے کہ اس کو اللہ کا بہت بڑا عطیہ فرماتا ہے۔اتنا بڑا عطیہ کہ اولین وحی میں تخلیق انسانی کے ذکر کے بعد اسی عطیہ کو بیان کرتا ہے۔اب انداز لگاؤ اس کی اہمیت کا! یوں تو اللہ کے لامحدود عطیے ہیں لیکن قلم اور کتابت کی راہ سے علم عطا فرمانا وہ عطیۂ خاص ہے کہ اولین وحی میں صرف تین عطائے الٰہی کا ذکر ہے جن میں ایک یہ ہے۔

ان تین عطایا کا ذکر بہ ترتیب ذیل ہے:

۱	انسان کو علق سے پیدا فرمایا۔	(خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ)
۲	قلم کے ذریعہ علم عطا فرمایا۔	(عَلَّمَ بِالْقَلَمِ)
۳	اور ذرائع سے بھی علم دیا۔	(عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ)

(جواہر البیان فی تفسیر القرآن،جلد دوم:علامہ عزیز الحق کوثر ندوی،
مطبوعہ بنارس (یوپی) بھارت،۲۰۰۹ء)

تحریک آزادی میں اسلامیان ہند
کے لیے جدید تعلیمی استعداد کی اہمیت
اور علماءِ کرام کا کردار

سب سے اوّل ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں پر سے اُن خیالات کا اثر دور ہو جو اُن کو جدید تعلیم میں ترقی کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ یہ کام فی الحقیقت ہماری قوم کے علما کا ہے کیوں کہ وہی مسلمانوں کو سمجھا سکتے ہیں کہ یہ عین مذہب کا منشا ہے کہ ہم علمی اور اخلاقی میدان میں ترقی کریں۔ اسلام نے علم کی ضرورت اور وقعت کو جس قدر سمجھایا ہے کسی ملت نے ایسا نہیں کیا۔ کلام پاک میں ارشاد ہے۔ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ''(اور اے پیغمبر) دعا کرتے رہا کرو کہ اے میرے پروردگار مجھے اور زیادہ علم نصیب کرنا''۔ دولت کے لیے نہیں کی، اولاد کے لیے نہیں، ملک کے لیے نہیں، دنیاوی سر و سامان کے لیے نہیں، ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا اگر کی تو زیادتی علم کے لیے۔ اب یہ ہمارے علما کا کام ہے کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو سمجھائیں کہ جدید تعلیم میں اعلیٰ مدارج حاصل کرنا عین دین کا منشا ہے۔

(رپورٹ متعلق اٹھائیسواں سالانہ اجلاس ۱۹۱۴ء۔ آل انڈیا محمدن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ راولپنڈی، صفحہ ۱۲۷)

مولانا زبیری کے دیباچہ کی چند سطور

اٹھارھویں صدی کے آخر سے اُنیسویں صدی کے چوتھائی سے زیادہ عرصہ تک مسلسل چالیس بیالیس برس کی مدت میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانانِ ہندوستان میں جس استقلال و استقامت کے ساتھ تعلیم منادی کا فرض انجام دیا ہے اور جس طرح قوم کے اندر علوم جدیدہ کی اشاعت و تبلیغ میں پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے جو بلاشبہ یہ ایک بیش بہا قومی خدمت ہے۔ جس زمانہ میں اور جن حالات کے اندر کانفرنس قایم ہوئی اس وقت دنیا متحرک تھی اور مسلمان ساکن و جامد۔ قومی تعلیم کے لحاظ سے وہ ایک تاریک زمانہ تھا جس کے اندھیرے میں ہماری تمام حسیاتِ ملی مُردہ ہو رہی تھیں۔ اس مجلس کے میر مجلسوں نے دور حاضرہ کی ضرورت اور حقائق حالات کی بنا پر اپنے زبردست خطبوں کے ذریعہ سے قوم کو تعلیم پر متوجہ کرنے کی اہم کوشش کی۔

دیباچہ: خطباتِ عالیہ، حصہ اوّل
مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۲۷ء

ایک اور اقتباس

ہر زبان کے خطیبوں کے خیالات اور افکار ذہنی و دماغی کا ذخیرہ اُس زبان کا بیش بہا سرمایہ متصور ہوتا ہے جس زبان میں کہ وہ ادا کیے جاتے ہیں۔ جو اپنے زمانہ کے لحاظ سے راہِ عمل اور مستقبل کے لیے قوم کی ہمت اور جوش کا افسانۂ تاریخی صفحۂ عالم پر اُن کے کارنامۂ عمل کی زندہ یادگار بن کر چمکتا ہے۔ موجودہ نسلیں اُن کے ساتھ خواہ کچھ ہی سلوک کیوں نہ کریں، لیکن یقیناً آنے والی نسلیں اُس کو شوق سے پڑھتی ہیں اور اپنے ماحول کے مطابق گزرے ہوئے حالات کے لحاظ سے استخراجِ نتائج میں اپنے پیش رووں کے ٹھوس اور عمیق افکار سے مدد لے کر اُن کی دماغی کاوشوں کا (خواہ وہ ملکی پالیٹکس سے تعلق رکھتی ہوں خواہ تعلیماتِ عامہ یا بہبودیٔ قوم کے دیگر امورِ مہمات سے) غرض ہر طرح سے خیر مقدم کرنے میں پیش قدمی کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا طرح طرح سے اپنی قوم کے دانشوروں کے خیالات کی اشاعت کرتی رہتی ہیں؛ گویا اس طریقہ سے گزرے ہوئے لوگوں کا پیغام آنے والی نسلوں کو پہنچا کر ان میں عمدہ تعلیم، بہتر تربیت، پاکیزہ اخلاق کی تخم ریزی کر کے اُن کی نشو و نما میں مصروف نظر آتی ہے۔

الفہرس

عکسی خزانۂ نوادر

دیباچہ

مولانا سید سلیمان اشرف کا یہ خصوصی خطاب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اٹھائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۴ء بمقام راولپنڈی ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت مولوی حاجی سر[1] رحیم بخش مرحوم نے کی۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ ایجوکیشنل کے تمام اجلاس ہر سال باقاعدہ متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر منعقد ہوتے رہے، جن میں پورے ہندوستان سے مختلف علاقوں میں رہنے والے

---

[1] رحیم بخش، مولوی سر: (تقریباً ۱۸۶۱-۴؍مئی ۱۹۳۵ء): وطن ٹھکا میراں جی (ضلع کرنال)۔ نارمل اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ شہر انبالہ میں پندرہ روپے ماہوار پر مدرس مقرر ہوئے ترقی کر کے چیفس کالج لاہور میں ۱۲۵ روپے مشاہرے تک پہونچے۔ نواب صادق محمد خاں رابع والئی بہاولپور چیفس کالج میں آئے، تو مولوی صاحب ان کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ چنانچہ وہ انھیں بہاولپور لے گئے جہاں ۱۸۹۷ء تک ۴۰۰ روپے ماہوار تنخواہ ہوئی۔ پھر کسی معاملے میں اختلاف رائے کی بنا پر مولوی رحیم بخش صاحب نے استعفا دے دیا۔ نواب صاحب نے پچاس روپے ماہوار وظیفہ تاحیات مقرر کر دیا۔
۱۹۰۳ء میں نواب بہاول خاں پنجم نے پھر بہاول پور بلالیا، جہاں مشیر امور خارجہ مقرر ہوئے۔ نواب موصوف نے حج سے واپسی پر انتقال کیا تو ان کے جانشین کی کم سنی میں مجلسِ نیابت (کونسل آف ریجنسی) بنی جس کے صدر مولوی صاحب مقرر ہوئے۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں ۲۰,۰۰۰ روپے نقد انعام اور ۱۰,۰۰۰ سالانہ وظیفے پر ریاست کی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔ تمام تعمیری، اصلاحی، تعلیمی اور مذہبی اداروں سے انھیں وابستگی تھی۔
'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'، 'ندوۃ العلماء'، 'راجپوت کانفرنس' سب کی صدارت کی۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ 'مرکزی انجمن تبلیغ اسلام' کی بنیاد استوار کی۔ انجمن اصل میں میر غلام بھیک نیرنگ، کنور عبدالوہاب خاں اور مولوی رحیم بخش ہی کی ممنونِ احسان تھی۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے لیے یک مشت ۱۰,۰۰۰ روپے جیب سے دیے۔ ہزاروں روپے مساکین کو بھی دیتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد حکومت پنجاب نے انھیں بہ اصرار 'مجلسِ وضع قانون' کا رکن نامزد کیا۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، جلد اوّل۔ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۶۶۲)

اور قومی ترقی کے خواہش مند افراد شرکت کرتے۔ کانفرنس کے شاندار اجلاس پشاور اور راولپنڈی سے ڈھاکہ اور رنگون تک اور دلی سے کراچی، بمبئی اور مدراس تک منعقد ہوئے جن سے ملک کے طول و عرض میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ کل ہند سطح پہ مذکورہ کانفرنس کب اور کیوں کر قائم ہوئی، کانفرنس کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ تفصیلاً بیان کرتے ہیں کہ نسل نو آگاہ ہو سکے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قیام اور اغراض و مقاصد:

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام (جسے بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کے گیارہ سال سات مہینے بعد) دسمبر ۱۸۸۶ء میں عمل میں آیا۔ اس ادارے کے بنیادی مقاصد میں علی گڑھ کے علاوہ دیگر علاقوں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پر غور و خوض کرنا اور ان میں مغربی تعلیم کے حصول کا شوق اور اپنی تعلیمی پس ماندگی[1] کو دور کرنے کا شعور پیدا کرنا شامل تھے۔

سیّد الطاف علی بریلوی (م: ۲۴ رستمبر ۱۹۸۶ء) علی گڑھ یونی ورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ سرسیّد کی انجمن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے پندرہ سال (۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۰ء تک) وابستہ رہے۔ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> 'سرسید علیہ الرحمۃ کی زندگی کے اہم کاموں میں سے ایک عظیم الشان کارنامہ 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'[2] کا بھی ہے، جس کو انھوں نے

---

[1] متحدہ ہندوستان میں مسلمان تعلیمی لحاظ سے کس قدر پس ماندہ تھے۔ مولانا سلیمان اشرف نے اس پر ہندو اور مسلم تعلیمی تناسب کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ (تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھیے: 'النور' علی گڑھ، ۱۹۲۱ء اور محمد صدیق: 'پروفیسر مولوی حاکم علی'۔ لاہور، جنوری، ۱۹۸۳ء)۔

[2] 'دارالعلوم علی گڑھ میں کانفرنس کے صدر دفتر کی عظیم الشان ذاتی عمارت سلطان جہاں منزل، اس کا خوشنما ہال اور نادر کتاب خانہ زمانۂ دراز سے مرجعِ خلائق اور صاحبانِ علم و عمل کا ملجاو ماوا رہا۔ بڑے بڑے قومی اجتماعات ہوتے رہے، اور ترقی و فلاحِ ملی کی جدوجہد جاری و ساری رہی'۔ (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی صد سالہ تاریخی ڈائری ۱۸۸۶ء لغایۃ جون ۱۹۸۶ء، طبع کراچی، ص ۸)

علی گڑھ[1] کالج کھولنے کے گیارہ سال بعد ۲۷ ردسمبر ۱۸۸۶ء کو قائم کیا۔ گزشتہ پینسٹھ سال سے اس کانفرنس کے مقاصد کی تشریح اور ان کا اعلان مسلسل طور پر جس بلند آہنگی سے ہوتا رہا ہے اس سے مسلم قوم کا ہر فرد واقف ہے۔

اب سے ساٹھ پینسٹھ سال قبل مسلمانوں میں ایک دوسرے کے حال سے بے خبری کا یہ عالم تھا کہ ایک صوبہ تو درکنار، ایک شہر کے مسلمان بھی قومی اغراض اور قومی بھلائی کی خاطر ایک جگہ جمع ہونا اور قومی اصلاح وترقی کی تدابیر پر کچھ سوچنا اور غور کرنا نہ جانتے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے باشندے زمانہ کی رو کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اور مسلمان تعلیمی، اخلاقی، مادّی غرض ہر قسم کے ترقی بخش وسائل سے ناآشنائے محض تھے۔ یہ وہ حالات تھے جن سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے یہ قومی ادارہ وجود میں لایا گیا۔ اور بے شبہ آج کی تمام حسّیاتِ ذہنی اور انقلابِ خیالات اس کانفرنس ہی کے رہین

---

[1] 'علی گڑھ ایک پیارا نام ہے۔ سرسید ایک حدیث شریف کے حوالے سے لکھتے ہیں: "ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور یہ قول ہے کہ انا مدینۃ العلم وعلی بابھا۔ پس یہ پہلا مدرسہ ہم مسلمانوں کا، جو در حقیقت علم کا دروازہ ہوگا، علی گڑھ ہی میں ہونا چاہیے۔' (اقتباس از کمیٹی خزینۃ البضاعۃ، اجلاس نہم منعقدہ ۱۸۷۲ء بحوالہ ایم۔ وائی انصاری، پروفیسر: 'سرسید اور فن تعمیر' مشمولہ: مقالاتِ سرسیّد صدی (مارچ ۱۹۹۸ء) کراچی۔ سرسید یونی ورسٹی پریس، ص ۵۰)

نوٹ: سرسیّد، کمیٹی 'خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین' کے لائف سیکرٹری تھے۔ اس کمیٹی کا دفتر علی گڑھ کالج کے قیام تک بنارس میں رہا چوں کہ سرسیّد بسلسلہ ملازمت (۱۸۷۰ء) بنارس میں ہی مقیم تھے (حیات جاوید، حصہ اول، طبع ثانی، ص ۱۳۰)۔ سرسیّد نے اپنے مشن کی تکمیل اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کو عام کرنے کی غرض سے مذکورہ کمیٹی قائم کی تھی۔ کمیٹی کا مقصد مجوزہ کالج (اینگلو اورینٹل کالج) کے قیام کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ کمیٹی نے سرسید کو کالج کے لیے فنڈ (چندہ، عطیات) جمع کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ (ایچ۔ بی۔ خان، ڈاکٹر: 'تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان وقرارداد مقاصد' الحمد اکادمی، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۵)

منت ہیں جس نے اجتماعِ ملّی پر سب سے پہلے آواز بلند کی[1]۔ جلسوں کے آئین و

---

[1] اس حقیقت سے انکار نہیں چناں چہ مولانا سلیمان اشرف نے بھی ایک موقع پر علی گڑھ کے ہی فیض یافتگان (علوم مغربیہ) جنھوں نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے اکثر آواز بلند کی، اور مستقبل میں ملک وملّت کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیا، کا تذکرہ کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

'یہ واقعہ ہے، حقیقت ہے اس سے انکار کرنا سُورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے کہ ہندوستانیوں کا حکومت کے سامنے آنا اپنے مطالبات کو موثر پیرایہ میں پیش کرنا ثبات وقرار سے اپنے حقوق کے طلب میں مسلسل سرگرم کار رہنا اور پھر اپنی کامیابی کے لیے ایثار وقربانی سے دریغ نہ کرنا یہ سب تعلیم انگریزی کا ثمرہ ہے۔ آئین سلطنت پر جنھوں نے نکتہ چینی کی ہے وہ انگریزی خواں ہیں حکومت خود اختیاری کا جنھوں نے نعرہ بلند کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں غلامی کی ذلتوں کا جس نے احساس پیدا کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں۔......طرفگی یہ کہ سارے انگریزی خواں اُنھیں کالجوں کے تعلیم یافتہ اور سندیاب ہیں جن کا الحاق گورنمنٹ کی یونی ورسٹیوں سے ہے سرکاری کالج یا امدادی کالج میں تعلیم پانے سے اُن کے جذبات قومی نہ فنا ہوئے نہ مٹے'۔ (النور:۱۹۳)

......لیکن متذکرہ طبقہ کو انگریز کی غلامی کا طعنہ دینے والے اراکین خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کے قائدین (بالخصوص مفتیانِ سیاسی) نے جب تحریک ترک موالات (۱۹۲۰ء) کے دوران آزاد قومی یونی ورسٹی کے قیام کی آڑ میں مسلمانوں کے تعلیمی اداروں جیسے اسلامیہ کالج لاہور کو نشانہ بنایا، اور اسلامیانِ ہند کی عظیم درس گاہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پر حملہ آور ہوئے (حال آں کہ بقول ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد: 'خلافت کا کام کرنے والوں میں ۴/۳ علی گڑھ کے طلبا تھے۔ اور علی گڑھ ہی ان کی فیکٹری تھی اگر اس کو ہی تباہ کردیا جائے تو کام کرنے والے کہاں سے ملیں گے')، تو مولانا سلیمان اشرف نے اُس وقت حقیقت حال سے پردہ اُٹھاتے ہوئے ان حضرات کو خبردار کیا کہ......'اس وقت (یعنی تحریک خلافت وترک موالات کے دوران) علماء سیاسی میں جو خروش وجوش ہے وہ بھی نتیجہ انھیں انگریزی خوانوں کا ہے انھیں کے ہاتھوں نے انھیں جھنجوڑا، جب ان کی آنکھیں کھلیں انھیں کے ہاتھوں نے سہارا دیا جب ان کے قدم اُٹھے انھیں کی آوازوں نے ان کی زبانیں کھولیں جب یہ بولنے لگے۔......اس وقت بھی اگر انگریزی خواں جماعت ان تحریکات سے الگ ہوجائے تو سارے جمعیت العلماء کے فضلائے یگانہ اپنی اپنی درسگاہوں میں ہوں گے یا منبر ومحراب میں کسی یتیم خانہ یا مدرسہ یا مسجد یا انجمن اسلامیہ کا وعظ فرما کر آخر میں تحریک چندہ فرماتے ہوں گے۔ وزرائے انگلستان کے آرا پر تنقید اور سیاستِ ہند پر مباحثہ کسی کے وہم میں بھی نہ آئے گا'۔ (وہی حوالہ:۱۹۴)

ضوابط اور مطالباتِ قومی پر بحث و مباحثہ کے طریقے سکھائے، اور اعلیٰ خیالات کا ایک ایسا بلند مینار تیار کیا جس پر چڑھ کر قوم نے اپنی حالت کو دیکھا، اور تباہ کن راہوں کو ترک کر کے ترقی پزیر شاہراہوں پر گامزن ہوئی'۔ [1]

آگے چل کر سید بریلوی (علیگ) مرحوم رقمطراز ہیں:۔

'کانفرنس نے اپنے مقصد اور نصب العین کے مطابق مسلمانوں میں ہر ممکن اور مناسب طریقہ سے صحیح تعلیم کو رائج کیا نہایت استقلال کے ساتھ تصنیف و تالیف و تراجم کے ذریعہ اسلامی لٹریچر اور تاریخ کی حفاظت، اردو کی ترویج و اشاعت کے ذرائع کی بہم رسانی، معلوماتِ تعلیمی کے لیے اعداد و شمار کی ترتیب و تدوین، اصلاحِ تمدن کے وسائل کی فراہمی، ہزار ہا ضرورت مند طلبا کو لاکھوں روپے وظائف، مدارس و انجمن ہائے اسلامی کا قیام، اور اُن کی ہر قسم کی امداد کے علاوہ سب سے بڑی خدمت مسلم یونی ورسٹی کو وجود میں لانے کی انجام دی۔ اسی طرح مسلم گرلس کالج علی گڑھ، ڈھاکہ یونی ورسٹی، انجمن ترقی اردو اور مسلم لیگ [2] جیسے قابل فخر مسلمانوں کے قومی ادارے کانفرنس ہی کی تحریک و تشویق سے معرض وجود میں آئے۔ تعلیم عربی اور مذہبی تعلیم کے مشہور اداروں مثلاً ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ کی امداد و اعانت میں بھی کانفرنس نے بہت بڑا حصہ لیا'۔ [3]

آئندہ سطور میں ایک اہم حوالہ ملاحظہ فرمائیں، سید معروف لکھتے ہیں:

'سر سید احمد خاں کو جب 'محمڈن کالج' کے قیام ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کی جانب سے

---

[1] آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی صد سالہ تاریخی ڈائری: ۱۸۸۶ء لغایۃ جون ۱۹۸۶ء، مرتبہ: سید الطاف علی بریلوی (علیگ)، طبع کراچی، ص ۸، ۹۔

[2] 'سالہا سال تک کانفرنس کے ساتھ ہی لیگ کے اجلاس ہوتے رہے تا آنکہ حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں مسلم لیگ اس قدر بڑھی کہ اس کی جہد خاص سے پاکستان وجود میں آیا جو آج دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے'۔ (ایضاً، ص ۹)

[3] ایضاً، ص ۹

اطمینان ہوا تو انھوں نے سوچا کہ صرف ایک کالج سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوگا اس لیے کہ دور دراز علاقوں میں رہنے والے مسلمان ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر ہیں اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ صوبوں اور اضلاع کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور قوم کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں کہ قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو اور تعلیم و ترقی کی سمت نمائی ہو سکے۔ اسی خیال کے تحت ۱۸۸۶ء میں انھوں نے 'محڈن ایجوکیشنل کانفرنس' کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۹۰ء میں اسے آل انڈیا محڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ابتدا میں کانفرنس کے مقاصد حسب ذیل تھے (دیکھیے پنجاہ سالہ تاریخ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۳۷ء)

۱۔ مسلمانوں میں یورو پین لٹریچر کے پھیلانے اور اس کو وسعت دینے اور انھیں اعلیٰ درجے کی تعلیم دینے کی کوشش کرنا۔

۲۔ مسلمانوں نے جو قدیم علوم میں ترقی کی اس کی تحقیقات کرا کے شائع کرنا۔

۳۔ نامی گرامی علما اور مشہور مصنفینِ اسلام کی سوانح عمریوں کو اردو یا انگریزی میں لکھوانا۔

۴۔ مسلمان مصنفین کی وہ تصنیفات جو نایاب ہیں ان کا پتا لگانا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں اور پھر انھیں از سرِ نو شائع کرنا۔

۵۔ تاریخی واقعات اور قدیم تحقیقات پر لوگوں کو تقریر پر آمادہ کرنا۔

۶۔ بنیادی علوم کے کسی مسئلہ یا تحقیقات پر کسی رسالہ کے تحریر ہونے یا لکچر دینے کی تدابیر کرنا۔

۷۔ فرامینِ شاہی کو بہم پہنچا کر ان سے کتابِ انشا کا مرتب کرانا اور ان کے نمونے فوٹو گراف کے ذریعہ سے قائم کرنا۔

۸۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے قائم ہیں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور بقدرِ امکان عمدگی سے اس

تعلیم کو طلبا میں پھیلانا۔ (پنجاہ سالہ تاریخ، ص ۴۔۵)[1]

آگے جانے سے پہلے اگر پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال کے مقالے 'یگانہ۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' سے استفادہ کرلیا جائے، تو مذکورہ دور کے سیاسی و سماجی، تہذیبی و تمدنی، فکری و مذہبی اور علمی و ادبی پس منظر سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

'خالص علمی نقطۂ نظر سے اس عہد کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے ہاتھوں پٹ جانے کے بعد ہندوستان کے لوگوں میں فکری و علمی افلاس کا احساس شدید ہوگیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب قدامت اپنی تمام بچی کھچی قوت اور توانائیوں کو سمیٹ کر جدیدیت سے ٹکرا گئی تھی۔ فکری و علمی افلاس اپنے ساتھ غلامی، محکومی اور نقاہت لے کر آیا۔ ایسے میں ایک طرف تو وہ طبقہ تھا جو پُرانے معیاروں ہی کو سب کچھ جانتا تھا اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو روحانیت کے مقابلے میں مادّیت کی طرف جھکتے جارہے تھے (؟) اور

---

[1] محمد معروف، سید۔ مضمون بعنوان 'انجمن ترقی اردو: مختصر تاریخی جائزہ' مشمولہ: ادب و کتب خانہ، کراچی: بزمِ اکرم، ۲۰۱۴ء، ص ۴۰۔

[2] ایسے پُرخطر اور کٹھن مرحلے میں بھی ہمیں مولانا سلیمان اشرف ہی کا آہنگ سنائی دیتا ہے، جو ان کی غیر معمولی دینی غیرت و حمیت اور مومنانہ حق گوئی و بے باکی پر شاہدِ عادل ہے چناں چہ اپنے رسالہ 'الرشاد' میں یاد دلاتے ہیں: 'مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی یہی ہے کہ یہ کسی غیر قوم کی طرف اس غرض سے بڑھتے ہیں کہ اپنی حیاتِ دنیا سنوارنے کا طریقہ اُس سے سیکھیں، لیکن اس سے پیشتر کہ اُن وسائل و اسباب پر اُنھیں دسترس ہو دین و مذہب پہلے کھو بیٹھتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک عہد عیسائیت کے ساتھ تعشق و شیفتگی کا تھا مسلمان ہمہ تن اُس میں حلول و جذب ہوجانے کے لیے بے تاب تھے۔ لیڈرانِ قوم نے اُس وقت نہایت بلند آہنگی سے یہ صور پھونکا تھا کہ اگر باعزت و حرمت دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو یورپ میں جذب ہوجاؤ، مسلم ہستی بذاتِ خود قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلامی انداز جلد سے جلد چھوڑ دو اور یورپ کے اسلوب اختیار کرو۔ پھر کیا تھا مسلمانوں کی شکل و صورت، لباس و پوشاک طرز ماند و بود غرض ہر ایک شعبۂ حیات میں یورپ ہی کی تجلّی تھی۔ حتّٰی کہ نام تک یورپین تلفظ و املا میں شامل کرلیا گیا، ارکانِ اسلام سے بیگانہ وشی لوازمِ تہذیب و تعلیم قرار پائے، عیسائیت میں جذب ہونے کے لیے مسائلِ شرعیہ میں طرح طرح کی تحریفیں کی گئیں، آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے مطالب میں عجیب و غریب معنی آفرینیوں سے کام لیا گیا'۔ (الرشاد: ۱۹، ۲۰)

جن میں گرد و پیش کا تجزیہ کرنے کا شعور موجود تھا، سرسید کی علمی و ادبی تحریک نے اس لمحے میں جنم لیا۔ علی گڑھ تحریک کے پس منظر میں شاہ ولی اللہ (۱۷۶۲ء۔۱۷۰۳ء) کے علمی نظریات دکھائی دیتے ہیں[1]۔ سرسید علوم عقلیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی تحصیل کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دے کر علمی سطح پر اس کے فروغ کے لیے کام کیا۔ سوسائٹیاں، مدرسے اور کالج قائم کیے اور اپنے نظریات و افکار کی ترویج کے لیے اپنے بڑے بھائی سیّد محمد خاں کے فارسی اخبار 'سیّد الاخبار' سے کام لیا اور پھر خود بھی 'سائنٹیفک[2] سوسائٹی گزٹ' اور 'تہذیب[3] الاخلاق' کا اجراء کیا جنہیں برصغیر[4] (برعظیم) کی صحافتی، علمی اور ادبی تاریخ میں خاصا نمایاں مقام حاصل ہوا۔[5]

۱؎ 'سرسیّد نے اپنی تصانیف میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو اکثر جگہ نقل کیا ہے اور اپنے دلائل کو اس سے تقویت دی ہے'۔ (سرسیّد کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے۔ ص ۱۴۲)

۲؎ ۱۸۶۲ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی، تو اس کا ایک مقصد سرسید نے یہ قرار دیا تھا کہ ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب کتابوں کو تلاش کر کے چھاپا جائے۔ بریلی میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

> "کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھو دے"۔ (جواب ایڈرس انجمن اسلامیہ بریلی۔ "لکچروں کا مجموعہ"، ص ۱۴۴)

سید احمد خاں سے زیادہ قومی اور تاریخی سرمایہ کی محافظت کا خیال شاید ہی ہندوستان میں کسی شخص کو پیدا ہوا ہو۔ آثار الصنادید کو لکھتے وقت ان کا جذبہ یہی تھا کہ کاروانِ رفتہ کے ایک ایک نقش کو محفوظ کر لیا جائے۔ انھوں نے فارسی مأخذ تاریخ کو ایڈٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی، ابوالفضل کی آئینِ اکبری اور جہانگیر کی تزک کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ گزشتہ کم و بیش ایک صدی سے سرسیّد کے مرتب کیے ہوئے یہ ایڈیشن تاریخ کے طلبا کے زیرِ مطالعہ ہیں۔ ان کتب وغیرہ کو شائع کرتے وقت ان کے ذہن میں اگر کوئی بات تھی تو یہ کہ اپنے تاریخی سرمایہ کو دست بردِ زمانہ سے بچا لیں'۔ (نظامی، پروفیسر خلیق احمد۔ 'سرسیّد کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے'۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی، ۱۹۹۳ء۔ ص ۸۸۔۸۷ وبعدہٗ)

۳؎ ۱۸۷۰ء میں 'تہذیب الاخلاق' کا اجراء ہوا۔ 'تہذیب الاخلاق' نے سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور ادبی پہلوؤں کا احاطہ کیا اور ذہنی انقلاب کی راہیں کشادہ کیں۔

۴؎ 'لوگ Sub Continent of Indo-Pakistan کا ترجمہ برصغیر پاک و ہند کر دیتے ہیں۔

(باقی بر صفحۂ آیندہ)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مقالہ میں اس دوران ہندوستان میں قائم کیے جانے والے بعض سرکاری وغیر سرکاری تعلیمی اداروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ: ۱۸۵۷ء کا سال ایک ایسی حد بن کر آیا جہاں قدیم اور جدید ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ دہلی کالج[۱] کی تاسیس ۱۸۲۵ء میں ہوئی۔ اس سال کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونی ورسٹیاں قائم کی گئیں۔ ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند[۲] کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۷۰ء میں لاہور میں 'اورینٹل کالج' قائم ہوا جہاں السنہ مشرقی کی

....

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

حالاں کہ اس میں 'بنگلہ دیش' بھی شامل ہے۔ ثانیاً جب ہم (Continent) کا ترجمہ براعظم کرتے ہیں، تو پھر Sub Continent کا ترجمہ برصغیر کیوں کر صحیح ہے۔ اعظم کا اسمِ تصغیر عظیم ہے صغیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شہرۂ آفاق مورّخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی تصنیف کا نام 'برِعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ' رکھا۔ اُس وقت تک بنگلہ دیش کا وجود نہ تھا'۔ (محمد اسلم، پروفیسر: 'تحریکِ پاکستان'، ص ۱۲)

۵ نجیب جمال، ڈاکٹر: 'یگانہ۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'۔ لاہور، اظہار سنز۔ بار اوّل ۲۰۱۳ء، ص ۴۶، ۴۷۔

۱ 'دہلی کالج کی تاسیس کے مقاصد میں اگرچہ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے علاوہ ہندوستانی کلرک سستے داموں خرید کر سیاسی بے اطمینانی کم کرنا تھا مگر بقول عتیق صدیقی: 'یہی کالج آگے چل کر مغربی علوم اور مغربی خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز اور ہماری نشاۃ الثانیہ کی تحریک کے ان نوخیز پودوں کی آب یاری کا بڑا منبع بن گیا جن کی فورٹ ولیم کالج (قائم شدہ ۱۸۰۰ء) نے تخم ریزی کی تھی۔ دِلّی کالج نے وقت کے شدید تقاضوں کو جس طرح پورا کیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علموں میں مورّخ، سائنس دان، ادیب، نقاد، ریاضی داں اور اخبار نویس بھی نکلے جو اُردو اخبار نویسی کے سابق الاوّلوں میں گنے جاتے ہیں'۔ (''ہندوستانی اخبار نویسی۔ کمپنی کے عہد میں'') انڈس پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۲۰)۔ دہلی کالج کا روشن پہلو یہ ہے کہ اس درس گاہ میں میکالے کے منصوبے کا وہ پہلو ثمر بار نہ ہو سکا جس کا مقصد ہندوستانی سر میں انگریزی دماغ رکھنا تھا'۔ (نجیب جمال، ڈاکٹر: ایضاً، ص ۴۷)

۲ بقول عبدالرشید میاں: 'دلچسپ بات یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کے بانی سید احمد خان اور دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی دونوں ایک ہی استاد مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ مولانا قاسم، حاجی امداد اللہ صاحب کے سلسلۂ بیعت میں داخل تھے۔ حاجی صاحب موصوف شاہ محمد اسحاق سے فیض یافتہ تھے، جو شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور جانشین تھے۔ حاجی صاحب ساری عمر مختلف اسلامی فرقوں کے اختلافات دور کرنے میں کوشاں رہے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ مسائل نزاعیہ میں سے اکثر میں محض نزاع لفظی ہے، اور مقصود متحد۔ شروع میں یہ حضرات فرقہ پرستی سے بالا راہِ اعتدال پر گامزن رہے، مگر بعد میں انھوں نے اپنی مصالحت پسندانہ روش ترک کر دی اور خود ایک

(باقی اگلے صفحہ پر)

تدریس کے ساتھ ساتھ یورپی علوم وفنون، جدید ہندوستانی زبانوں (عربی، فارسی، ہندی اور اُردو) کے ذریعے پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ۱۸۷۷ء میں سرسیّد نے جدید تعلیم کو فروغ دینے کے لیے 'محمڈن اینگلواوری اینٹل کالج' قائم کیا جس نے آگے چل کر مسلمانانِ ہند کی فکری و علمی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ سرسیّد ہی نے ۱۸۸۶ء میں 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' کی بنیاد ڈالی، جس نے 'آل انڈیا مسلم لیگ' کے قیام کی راہ ہموار کی۔[۱]

(بقیہ حاشیہ)

فرقہ بن کر دوسرے فرقوں کے مقابل آ گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی وسعت نظری کو بھی ترک کر دیا اور روحِ اسلام کو نظر انداز کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں پر زور دینے اور لڑنے جھگڑنے لگے۔ خاص طور پر ان کے افکار مغرب (یا علوم مغرب؟) سے بیزاری نے انھیں بہت نقصان پہنچایا۔ اپنے ذہنوں کو مسدود کر لینے کے باعث ان کے فکر کے سوتے خشک ہو گئے۔ نیز ان کی کانگرس سے وابستگی نے مسلمانوں کو بہت سیاسی نقصان پہنچایا۔ سوا مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے چند رفقاء کے، ان میں سے کسی قابلِ قدر ہستی نے تحریک پاکستان کا ساتھ نہ دیا'۔ (حوالہ: پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، مشمولہ: باب دیو بند۔ ص ۱۱۱ و بعدہٗ۔ ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۸۲ء)۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جمعیت العلماء ہند کے رول کو سراہنے والے عناصر، جواب وطن عزیز میں مولانا عثمانی مرحوم کی جمعیت علمائے اسلام کے پلیٹ فارم سے سیاست کر رہے ہیں، پاکستان کے قیام کو 'گناہ' سے تعبیر کرتے ہوئے اس مملکت کے بنانے اور اس کی حمایت کرنے والوں کو ملزم گردانتے ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کہتے ہیں: ''مفتی محمود اور مولانا یوسف بنوری، جو کہ جمعیت العلماء ہند صوبہ گجرات کے صدر تھے، ان دونوں کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کو پاکستان بنانے کے جرم کی پاداش میں قبر میں عذاب مل رہا ہے''۔ (حوالہ: دی گریٹ لیڈر (اردو)۔ جلد اوّل۔ ص ۷۹۔ آتش فشاں لاہور ۲۰۱۱ء)۔

۱؎ 'آج ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ سرسید نے جس سیاسی پالیسی کی بنیاد رکھی تھی، بالآخر قوم نے اسی کو اختیار کیا اور وہی کامیاب رہی۔ مسلمانانِ ہند کی فکری اور سیاسی لیڈرشپ مغربی تعلیم یافتہ اصحاب ہی نے سنبھالی۔ اقبال اور قائداعظم دونوں اعلیٰ مغربی تعلیم سے مرصع تھے۔ انھی کی مساعیٔ جمیلہ سے پاکستان قائم ہوا۔ اور پاکستان کا قیام سرسید ہی کی پالیسی کا نتیجہ اور اس کی صداقت پر مہر ہے'۔ (عبدالرشید، میاں۔ 'پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر۔ مشمولہ: سرسید احمد خان۔ ص ۱۱۰)۔ 'حقیقت یہ ہے کہ اگر سرسید اور ان کے مغربی تعلیم کی تحریک نہ ہوتی تو مسلمان آزادی کی تحریک میں اس طرح شریک نہ ہو پاتے۔ ۱۹۰۷ء میں مولانا محمد علی نے سرسید کی روح سے یہ کہہ کر۔

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا — جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

ایک تاریخی حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے'۔ (خلیق احمد نظامی، پروفیسر: 'سرسیّد کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے'۔ ص ۱۱۰)۔

۱۹۱۷ء میں حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا جس کا سہرا میر عثمان علی خاں والی حیدر آباد کے سر ہے۔ اس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام مغربی علوم اُردو زبان میں پڑھائے جانے لگے اس کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم بھی لازمی مضمون کے طور پر جزِ قرار رہی۔ مغربی علوم وفنون کی درسی کتابوں کے اُردو ترجموں کے لیے ۱۹۱۷ء میں 'دارالترجمہ' قائم ہوا جہاں مستند اور معیاری کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں مولانا محمد علی جوہر کی کوششوں سے 'جامعہ ملّیہ اسلامیہ' کا قیام عمل میں آیا، ۱۹۲۵ء میں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ [1]

ازیں علاوہ اسلامیہ کالج لاہور (قیام: یکم مئی ۱۸۹۲ء) اور اسلامیہ کالج پشاور (آغاز: ۱۹۱۳ء) بھی قائم کیے گئے تھے۔ سیّد احمد خان اور دیگر قائدین اس امر کو پا چکے تھے کہ صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ ہر قوم کی ترقی واعلیٰ کامیابی کا راز صرف مسئلہ تعلیم کے عمدہ طریقے سے حل ہونے پر مبنی ہے، اور یہ فریضہ ایجوکیشنل کانفرنس بخیر وخوبی انجام دے رہی تھی۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ انقلاب حکومت اور تغیراتِ زمانہ سے ہر چیز اثر پزیر ہوتی ہے، اس انقلاب اور مغربی خیالات کی ترقی واشاعت نے ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مسئلہ کو نہایت اہم اور ایک لحاظ سے پیچیدہ بھی بنا دیا تھا۔ جب کہ اسلامی عہد حکومت میں قدیم و جدید علوم کی کشمکش نہ تھی یہ مسائل کبھی زیر بحث ہی نہ آئے تھے، جو اس دور میں پیدا ہو گئے۔

جیسا کہ مشاہدہ میں آیا، متحدہ ہندوستان کے طول وعرض میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخیں قائم ہو رہی تھیں، تو بعض حساس مسلمان جو غالباً کم نظری مگر دیانت داری سے یا پھر شاید طرزِ کہن پر اڑنے اور آئینِ نو سے ڈرنے کے مصداق کانفرنس کی سرگرمیوں سے اپنے کو بچانا چاہتے تھے، کی جانب سے کچھ خدشات کا اظہار کیا جانے لگا، اور اس کے ازالہ کے لیے انھوں نے اس وقت کے اہل علم سے رجوع کرنا مناسب سمجھا اور ان کے سامنے ایک سوال استفتا [2] کی صورت

---

[1] یگانہ۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ص ۴۸

[2] استفتا۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس سوال میں کہ اس ملک کاٹھیاواڑ میں ایک مجلس بنام کاٹھیاواڑ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بنام کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کی تعلیمی مجلس قائم ہوئی ہے جن کے محرک ومختار متبعین ومتعلقین علیحدہ
(باقی بر صفحہ آیندہ)

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

کالج ہیں۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کو ان کا پہلا جلسہ جونا گڈھ میں ہوا، جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، نظامت کے فرائض منشی غلام محمد بیرسٹرایٹ لا کاٹھیاواڑی نمائندہ علیگڈھ کالج ومؤید آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے انجام دیے، حاضرین جلسہ سے خطاب مشہور واعظ مولوی سلیمان پھلواروی نے کیا۔ اس کانفرنس کا مقصد وحید تمام مسلمانوں کی دینی ودنیوی ترقی بتایا گیا ہے۔ ایک ایسی کانفرنس جس میں جُملہ مدعیانِ اسلام بشمول ایسے گروہوں کے کہ جن سے مسلمانانِ اہلِ سنت و جماعت کو بنیادی نوعیت کے اختلافات ہیں، ہم (بحیثیت سوادِ اعظم) کیا اس تعلیمی کانفرنس کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے کسی قسم کی معاونت کر سکتے ہیں۔ جواب آنے پر ان شاء اللہ تعالیٰ اس استفتا کو چھپوا کر اس ملک کاٹھیاواڑ و گجرات و برنا و غیرہا جگہ پر بغرض اشاعت مسلمانوں میں عام طور پر تقسیم کیا جائے گا۔

فقط...... راقم آثم خادم قاسم میاں عُفی عنہ

از مقام گونڈل علاقہ کاٹھیاواڑ

تاریخ ۱۲ر محرم الحرام ۱۳۳۵ ہجریہ مقدسہ پنجشنبہ

ماخوذ...... (استفتا: الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرہ) بار اوّل ۱۹۱۷ء

بدقسمتی کیسی اس قوم کے ہمرکاب رہی ہے کہ موہوم ومفروض خدشات کو بنیاد بنا کر علومِ عصری پر رقیب اقوام کے برابر لانے بلکہ ان پر سبقت لے جانے کی سعیٔ جمیل کے خلاف علمائے دین سے ایسے فتاوٰی حاصل کیے گئے، جن کے باعث اس راہِ روشن کو تاریکیوں سے ڈھانپ کر ملّت کی منزل کھوٹی کی گئی۔ ساون کے کچھ اندھوں کو آج بھی ہرا ہرا ہی سوجھتا ہے حال آنکہ زمانے کے پلوں کے نیچے سے پانی اپنی پوری رفتار کے ساتھ بہتا چلا آ رہا ہے۔ بعض ایسے ایمان فروش مفاد پرست بھی ہیں کہ ان فتاوٰی کے پشتارے اپنی کمر پر اُٹھائے سر بازار نفرتوں کی تجارت سے پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد نے کہا تھا: 'انقلابات وحادثات نے ماضی کے بہت سے نظریات کو یا تو ردّ کر دیا ہے یا پھر ان پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے'۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آج بھی بعض حضرات پوری استقامت کے ساتھ 'مرغ کی ایک ہی ٹانگ' پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ علامہ نے ہمارے اس مرض پر بجا طور پر کہا تھا۔

آئین نَو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا

منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مقامِ صد اطمینان امر یہ ہے کہ ہر ہر دَور میں صاحبانِ بصیرت نے بنظر غائر حقائق کو دیکھا اور رائے عامہ کی رَو میں بہ نکلنے کے بجائے اپنی بات دوٹوک انداز میں کہی بھی۔

چناں چہ فتاوٰی کی بھیڑ میں علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی حضرت مولانا محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ (۲ر اپریل ۱۸۹۳-۲۲ر اگست ۱۹۵۴ء) کا فتوٰی ایک روشن چراغ کی مانند آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ اُن کی دُور رس نگاہ کو خراجِ تحسین پیش کرتا نظر آتا ہے:

(۱۶) تصدیق جناب مولانا مولوی محمد عبد العلیم صاحب میرٹھی زید مجدہ

مبسملاً وحامداً ومحمداً (جلّ وعلا) ومصلیاً ومسلماً محمداً (صلی اللہ علیہ وسلم) امابعد
کاٹھیاوار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسلمانان کاٹھیاوار کی ایک تعلیمی انجمن ہے
مسلمانوں میں علوم کی روشنی پھیلانا اور ان کو جہالت کے قعر مذلت سے نکالنا ایک ایسا ضروری واہم امر ہے
جس کے متعلق قرآن عظیم میں یوں وارد ہوتا ہے ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون
بالمعروف وینھون عن المنکر نیز ارشاد ہوتا ہے کہ یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین
اوتوا العلم درجٰت طلب علم کے متعلق فرمان حضور عالم ماکان وما یکون صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے
کہ طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة نیز اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ لیکن سب سے
اہم سوال یہ ہے کہ یہاں علم سے مراد کونسا علم ہے کیونکہ مدینة العلوم حضرت سیدنا مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کا ارشاد
ہے کہ العلوم خمسة الفقہ للادیان والطب للابدان والھندسة للبنان والنحو للسان
والنجوم للزمان کذا فی مدینة العلوم وقال الامام الشافعی رحمة اللہ تعالیٰ علیہ العلم علمان
علم الطب للابدان وعلم الفقہ للادیان۔ سوال مذکور الصدر کا جواب آیات کلام عظیم واحادیث نبی کریم
علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مضامین کو ترتیب دینے سے بادنیٰ توجہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اس علم سے مراد
علم دین ہی ہے چنانچہ اسی پر مفسرین ومحدثین کا اجماع ہے۔ اور اگر جیسا کہ بعض ماولین معانی آیات واحادیث
کہتے ہیں کہ علوم ابدان بھی اسی میں داخل ہیں تو بھی یہ امر یقینی ہے کہ علوم دینی کو ہر نوع علوم ابدان پر
اولیت آن اولین کے نزدیک بھی مسلم ہوگی اسلیے معاملات تعلیم وتعلم علوم پر غور کرنے والوں کے لیے
منکم ہونا ہی نہیں بلکہ بحکم فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون اہل ذکر ہونا اہلکان رکن کا مورد
بننے کے لیے الذین اٰمنوا کا ہونا نیز طلب علم کی فرضیت کا حکم پانے والوں کے لیے مسلم ومسلمہ کا ہونا لابد ہے
پس جہاں مسائل تعلم وتعلیم پر غور کرنے کے لیے امت مرحومہ کے وہ افراد جمع ہوں جو یدعون الی الخیر
ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر اور اھل الذکر کے مصداق کہلائے جاسکیں اور تعلیمی مشورے لیں
یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم کی آیت کو ملحوظ رکھ کر تحفظ ایمان واسلام واشاعت علوم دین کے فرض
اہم واولین کو محسوس کرتے ہوئے ضمناً ضرورت زمانہ کے لیے تجارت وزراعت صنعت وحرفت نیز ایسی
السنہ وکتب کے تعلم وتعلیم کے متعلق بھی مشورہ کریں جن کے حصول سے دین میں نقصان آنے کا احتمال
اضعف بھی نہ ہو تو ایسی انجمن محمود اور ایسی انجمن کی شرکت مسعود کہی جائے گی البتہ اگر ارکان انجمن معرا
عن الایمان والاسلام ہوں اور مبحث مشورہ تعلیم وتعلم علوم مخرب دین وایمان تو وہ انجمن یقیناً مردود اور اس کی شرکت
سے اہل ایمان کے لیے ہر نوع گریز واجب جیسا کہ اکابر علما کے فتاویٰ سے بوضاحت ثابت ہو چکا۔ واللہ تعالیٰ اعلم
وعلمہ جل مجدہ اکمل واتم۔ فقیر محمد علیم رضا القادری غفرلہ

رسالہ الدلائل القاہرۃ کے صفحہ ۳۵ کا عکس

وما علینا الا البلاغ

مسلمانو تمہاری دین دنیا کی بھلائی اور سچی حقیقی خیر خواہی کیلیے یہ مبارک فتوے امام اہل سنت قامع بدعت قالع ندویت و نیچریت مجدد مائتہ حاضرہ مؤید طاہرہ اعلیحضرت مولٰنا مولوی مفتی احمد رضا خانصاحب قادری برکاتی متع اللہ المسلمین بطول بقائہم دربارہ کاٹھیاوار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے جسمیں بدلائل قاہرہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس میں شرکت اور کسی قسم کی امداد حرام اور سخت حرام ہے اسے بغور پڑھو اور اپنا بھلا چاہو تو اسپر عمل کرو نیز تمہارے مزید اطمینان کیلیے اس فتوے کی تائید و تصدیق میں مشاہیر علمائے ہند کے جلیل القدر فتوے مسمی بہ

الدلائل القاہرۃ
علی الکفرۃ النیاشرۃ

مؤلفہ

حامی سنت جناب حاجی قاسم میاں صاحب امام جامع گونڈل علاقہ کاٹھیاوار حسب فرمائش جناب منشی حاجی لعل خانصاحب ۲۲ زکریا اسٹریٹ کلکتہ جناب حکیم مولوی ابو العلا امجد علی صاحب اعظمی قادری رضوی سنی نے

مطبع اہل سنت و جماعت بریلی میں چھپا کر شائع کیا

عکس سرورق: رسالہ "الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرۃ" مطبوعہ بریلی ۱۹۱۷ء

ملنے کا پتہ:- دفتر جماعت اہل سنت۔ محلہ محتشم خاں۔ پیلی بھیت۔ یو۔ پی۔

ملنے کا پتہ:- سعید حسن خاں قادری رضوی۔ ناظم کتب خانہ اہلسنت۔ محلہ پورے خاں۔ پیلی بھیت۔ یو۔ پی۔

ملنے کا پتہ:- دفتر انجمن تبلیغ صداقت۔ ہمت منزل چاچا محلہ۔ کامیکر اسٹریٹ۔ بمبئی نمبر ۳

وما علینا الا البلاغ

مسلمانو تمہاری دین و دنیا کی بھلائی اور سچی حقیقی خیر خواہی کیلئے یہ مبارک فتوائے امام اہل سنت قامع بدعت قالع ندویت و نیچریت مجدد مائۃ حاضرہ مؤید ملت طاہرہ اعلحضرت مولنا مولوی مفتی **احمد رضا خانصاحب** قادری برکاتی رضی اللہ تعالے عنہ در بارہ کاٹھیاوار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے جسمیں بدلائل قاہرہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس میں شرکت اور کسی قسم کی امداد حرام اور سخت حرام ہے اسے بغور پڑھو اور اپنا بھلا چاہتے ہو تو اسپر عمل کرو نیز تمہارے مزید اطمینان کیلئے اس فتوے کی تائید و تصدیق میں مشاہیر علمائے ہند کے جلیل القدر فتوے مسمّٰی بہ

الدلائل القاهرة على الكفرة النياشرة

یعنے مسلم لیگ کی شرکت و رکنیت و امداد و اعانت کا حکم شرعی بھی واضح و آشکارا

مؤلفہ

حامی سنت جناب حاجی قاسم میاں صاحب امام جامع گونڈل علاقہ کاٹھیاواڑ

حسب فرمائش اراکین انجمن تبلیغ صداقت بمبئی

پرنٹر سلطان حسین خاں نے مطبع سلطانی ... بمبئی ۳ میں چھاپا اور

پبلشر

منشی مصطفٰے خاں قادری فیض آبادی نے شائع کیا

بار دوم ایکہزار جلد — ۱۹۴۲ء — قیمت

عکس سرورق: رسالہ "الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرۃ" طبع بمبئی ۱۹۴۲ء

میں مرتب کر کے یہ جاننا چاہا کہ مذکورہ تعلیمی کانفرنس کے اجلاسوں میں ان کی شرکت یا ان کی کسی قسم کی اعانت کے بارے میں کیا حکم ہے۔

وقت تفہیم کی راہیں بناتا ہے:

سن ستاون کے بعد (بالخصوص ۱۸۶۵ اور ۱۸۷۵ء کے درمیان) مغربی تعلیم کی ترقی پزیر حالت نے علمائے کرام اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے درمیان خاصا اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ تعلیمی کانفرنس کے قائدین مذکورہ احوال سے ہرگز بے خبر نہ تھے۔ اس لیے وہ اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے پیدا شدہ خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ امت مسلمہ کا اجتماعی مفاد ان کے پیشِ نظر رہا۔ یہ اختلاف بتدریج کم ہوا۔ ۱۹۲۵ء کے ایک اجلاس میں مولانا رحیم بخش اپنے خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں:

'..... افسوس ہے کہ اجتماعی حیثیت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا گیا اور نہ ابتدا میں ان دشواریوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی، جو مذہبی تعلیم کی راہ میں حائل تھیں۔..... ہر زمانہ کے لیے یکساں طریقہ تعلیم مفید نہیں ہو سکتا، اسی وجہ سے ہمیشہ بہ مقتضائے حالات تبدیلیاں ہوتی رہیں اور آئندہ بھی ہوں گی۔ اس لیے ہم کو ان جدید مشکلات کے حل کرنے کے لیے بھی آمادہ ہو جانا چاہیے، تاکہ ہر جماعت اپنے دائرہ عمل کے اندر کام کرے اور قدیم و جدید تعلیم کے لیے جو نظام عمل مرتب کیا جائے وہ ایسا صاف و واضح ہو کہ اختلاف آرا کا اندیشہ کلیتاً زائل ہو جائے۔

مغربی تعلیم کی روز افزوں ترقی و اشاعت نے آخر کار مسلمانوں میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا، جس کی آزادانہ معاشرت و عقائد نے قدیم جماعت[1] کے

---

[1] درد دل رکھنے والے علماءِ کرام اور اربابِ دانش ہمارے علماءِ دین کی عمومی روش پر بجا طور پر دکھی اور رنجیدہ رہتے تھے۔ پروفیسر سید سلیمان اشرف اعلی اللہ مقامہ اس ملی مرض کہنہ کی نشان دہی کرتے ہوئے ایک محکم سند پیش کرتے ہیں:۔

''تغیر عالم کو دیکھتے ہوئے علماءِ کرام نے اپنے دل و دماغ کو سیاسیات کی فکر سے ایسا بے نیاز کر لیا تھا کہ علامہ ابن خلدون کو اس مقدس گروہ کے حق میں یہ فیصلہ دینا پڑا کہ ابعد الناس عن السیاسیۃ ھم العلماء یعنی علماء کا دماغ سیاست کے سمجھنے سے بہت ہی دور ہے''۔

(بحوالہ: النور، ص ۱۹۱)

مذہبی جذبات کو اس حد تک برانگیختہ کر دیا کہ انھوں نے ان نوجوانوں کو ملحد و زندیق
قرار دیا۔ گویا مسلمانوں میں دو فریق پیدا ہو گئے جو مدت تک باہم دست وگریباں
اور ایک دوسرے سے ناآشنا رہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب رفتہ رفتہ یہ بے گانگی کم
ہوتی گئی، اور وہ وقت آ گیا کہ فریقین اپنی اپنی جگہ پر مسلمانوں کی مختلف تعلیمی
ضروریات کا احساس کر کے ایک ایسا تعلیمی نظام مرتب کریں، جو مسلمانوں کی ہر قسم
کی دینوی و مذہبی ضرورتوں پر مشتمل ہوتا کہ آئندہ تصادم کا اندیشہ نہ رہے۔ اب وہ
زمانہ آ گیا کہ نہ تو انگریزی پڑھنا کفر والحاد خیال کیا جاتا ہے اور نہ مذہبی تعلیم کی
ضرورت سے کسی کو انکار ہے، اس لیے کیوں نہ فریقین باہمی معاونت سے کام کریں
تاکہ ایک طرف تو مسلمانوں میں جدید علوم وفنون کا رواج ہو اور دوسری طرف ان کا
سینہ مذہبی علوم سے منور ہو، اور اسلامی تہذیب وشائستگی ان کا شعار ہو۔

علماء کو بھی اب جدید تعلیم کی ضرورت سے انکار نہیں ہے، اور ندوۃ العلماء[1]
کے پلیٹ فارم پر تو بارہا اس کا اعلان کیا گیا کہ وہ انگریزی تعلیم کو صرف قولاً ہی
ضروری نہیں سمجھتا بلکہ اس نے اپنے دارالعلوم میں انگریزی کو بطور زبان ثانی داخل[2]
کر کے عملاً بھی اس کا ثبوت دیا ہے کہ علماء کے لیے بھی مذہبی نقطۂ نظر سے انگریزی

....

[1] ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا، جس کا مقصد قدیم علماء اور علی گڑھ کے مدبرین کے انتہائی نقطہ ہائے نظر میں اعتدال اور توازن کا راستہ تلاش کرنا تھا اور اس کے ساتھ نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، تہذیب اخلاق، شائستگی اطوار کا فروغ، علماء کے باہمی نزاعات کا رفع کرنا اور عام مسلمانوں کی اصلاح وفلاح اس کے مقاصد تھے۔ اردو زبان کا سب سے بڑا اسلامی رسالہ 'معارف' ندوہ کی نشانیوں میں سے ہے'۔ (نجیب جمال، ڈاکٹر: یگانہ۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ ص ۴۴، ۴۵)

[2] 'ندوہ نے تکملہ علوم عربیہ ودینیہ کے ساتھ تعلیم انگریزی بھی داخل نصاب کی تاکہ اس مدرسہ کا فارغ التحصیل طالب العلم اگر انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہے تو پانچ برس میں گریجویٹ ہو جائے اور اگر مطالعہ ومحنت سے کام لے تو اس قدر استعداد اس میں موجود ہے کہ بغیر داخلہ کالج قوت مطالعہ سے ہر طرح کا فائدہ کتب انگریزی سے حاصل کر سکے۔ ندوۃ العلماء کے سند یافتہ اس وقت ملک میں موجود ہیں اُن کی لیاقت وفضل کا ثبوت اُن کی مصنفہ کتابوں سے ملتا ہے'۔ (محمد سلیمان اشرف: 'النور' علی گڑھ ۱۹۲۱ء، ص ۱۹۸)

ایسی ہی ضروری ہے جیسی عام مسلمانوں کے لیے، البتہ ندوہ کی یہ خواہش ضرور ہے کہ انگریزی تعلیم اسلامی تربیت کے ساتھ دی جائے، اور انگریزی خواں جماعت، اسلامی عقائد و روایات سے باخبر ہو، اس کا مقصد سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ مسلمان مسلمان رہ کر انگریزی حاصل کریں، اگر وہ ایسا کرسکیں تو اسلام ان کو کسی زبان اور کسی علم و فن کے سیکھنے سے منع نہیں کرتا، تاریخ اسلام میں بکثرت ایسی مثالیں موجود ہیں کہ مسلمانوں نے دوسری قوموں کے علوم و فنون سیکھے بلکہ ان علوم میں یہاں تک کمال حاصل کیا کہ استاد اور امام کے درجہ تک پہنچے۔ [1]

سیّد سلیمان اشرف کا چشم کشا خطاب:

مذکورہ حوالہ کے بعد اگر الخطاب (۱۹۱۴ء) سے درج ذیل اقتباس کا مطالعہ کرلیا جائے، تو ناظرین کرام کو احساس ہوگا کہ وہ مسلمان جو علومِ مغربی کو یعنی یورپ کا تمدن، سائنس سب کچھ کفر قرار دیتے [2] (کہ مسلمانوں کو اسلام کے اساسی منابع کی طرف لوٹنا چاہیے) تھے، کہاں کھڑے تھے؟ سید العلما مولانا سید سلیمان اشرف تمدن، سائنس اور قرآن مجید کے تحت فرماتے ہیں:

> 'پس اے عزیزو، کیا تمدن کی روح اس کے سوا اور چیز ہے؟ کیا سائنس الٰہی اس امر کو منکشف نہیں کرتا کہ کس چیز کو ہم کس طرح اپنے کام میں لائیں؟ اگر یہی بات ہے اور ضرور یہی ہے، تو میں ڈنکے کی چوٹ سے کہتا ہوں کہ تمدن و سائنس کی سنگِ بنیاد قرآن کریم کی یہی تعلیمات ہیں۔ سائنس پڑھنا، اس میں

---

[1] صدارتی خطبہ الحاج مولانا سر رحیم بخش: اجلاس بستم (۲۰واں) ندوۃ العلماء لکھنؤ منعقدہ ۲۸ر نومبر ۱۹۲۵ء بمقام انبالہ، بحوالہ تاریخ ندوۃ العلماء، (حصہ دوم) مرتبہ: شمس تبریز، مولوی۔ طبع لکھنؤ، بار اوّل ۱۹۸۴ء، ص ۲۹۳ و بعدہٗ۔

[2] مولانا سلیمان اشرف نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کے خیال میں ایک غیر ملکی اور غیر مسلم قوم کی زبان سیکھنا مذہباً جائز نہیں تو آپ نے مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کی، پُرزور مضامین اور خطبات کے ذریعے ایسے اوہام و خیالات فرسودہ کی نہ صرف تردید کی بلکہ ثابت کیا کہ مذہب علومِ جدیدہ کا مخالف نہیں ہے۔ اس طرح مسلمانوں میں سرسید کی تعلیمی کانفرنس کے خلاف نفرت میں کمی پیدا ہوئی اور تحریک علی گڑھ کو تقویت ملی۔

کمال پیدا کرنا، حقیقت میں مسخرہ مخلوق سے مستفید ہونا ہے، اور اُن کے مسخر ہونے کو بامعنی بناتا ہے۔ کوئی وجہ اس کی نہیں کہ قرآن ہمیں جن اُمور کی طرف رہنمائی کرے جن سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دلائے ہم اُسے مذہب کے خلاف سمجھیں۔ پھر تو کھانا پینا، پہننا، رہنا سب ہی دشوار ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ کون سی زبان میں ان علوم کو پڑھیں؟ اس تنگ وقت میں زیادہ بحث کا تو موقع نہیں لیکن اس قدر سمجھ لیجئے کہ اُردو، فارسی، پنجابی، پشتو، بنگلہ وغیرہ وغیرہ تو جائز ہوں مگر یورپ کی زبان حرام آخر اس کی وجہ؟ اگر آج تمام یورپ یا کوئی اُس کا حصہ دائرۂ اسلام میں آ جائے تو کیا اُسے اپنی مادری زبان کا بولنا یا اُس میں پڑھنا حرام ہو جائے گا؟ کیوں خدا کی رحمت کو اس قدر تنگ کیا جائے؟ اور ترجیح بلا مرجح دی جاوے؟ الحکمۃ ضالۃ المؤمن حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اپنی چیز جہاں تمھیں مل جائے اُسے فوراً اُٹھالو۔

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سُریانی

مکان کز بہر او جوئی چہ جا بلقا چہ جا بلسا [1]

ایک غلط فہمی کا ازالہ:-

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ بعض مسلم راہنماؤں کا خیال تھا اور بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی، 'وہ یہ سمجھتے تھے کہ سید احمد خاں مشرقی علوم کے دشمن ہیں اور اپنی ہر قومی چیز کی قیمت پر غیر ملکی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں' [2] سید احمد خاں کی پوری زندگی، ان کی تصانیف کا ایک ایک حرف اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مشرق کی ہر عمدہ چیز کو باقی رکھا جائے لیکن مغرب کی بھی کسی اچھی چیز کے حاصل کرنے میں گریز نہ کیا جائے۔ امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ایک بار کہا تھا:

'مسلمانوں کو بھی یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں۔ یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت میں سمٹک (Semtic) [3] زبانوں میں لاثانی ہے مگر افراط و تفریط نہ ہو۔ اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جب کہ ہماری معاش، ہماری بہتری، ہماری

---

[1] الخطاب، ص ۲۲، ۲۳ [2] 'آثار جمال الدین افغانی' ص ۱۴۱-۱۴۲ [3] سامی زبان۔ زبانوں کے افریشیائی قبیلے کی شاخ جس میں عبرانی، فنیقی، ارامی، اکادی، عربی اور حبشی زبانیں شامل ہیں۔

زندگی با آرام بسر ہونے کے ذریعہ بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف بہت توجہ کرنی چاہیے۔[1]

الغرض بقول انور معین زبیری، متذکرہ دور میں مسلمان خود مغربی علوم و فنون کو اپنے لیے ایک زبردست خطرہ سمجھتے تھے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے اداروں کو کم زور کرنے پر تلے ہوئے تھے۔[2] حال آنکہ ان تعلیمی اداروں کا قیام اور علوم کا حصول مسلمانوں کے مفاد میں تھا، مولانا سلیمان اشرف رقم طراز ہیں:

'انگریزی سلطنت جب اپنے ساتھ علوم مغربیہ ہندوستان میں لائی تو ہندوستانیوں نے دیکھا کہ اب بقا اور نمود کی زندگی بغیر علوم مغربی حاصل کئے ناممکن ہے، تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوؤں نے بڑھ کر تعلیم انگریزی کا استقبال کیا اور خوش آمدید کا نعرہ بلند کیا۔ جب اس قوم کے ایک خاص حلقہ میں یہ تعلیم پھیل گئی اور انگریزی کے واقف کار کچھ ہندوؤں میں تیار ہو گئے تو اُن میں احساس پیدا ہوا اور حکومت کے انداز فرماں روائی پر نکتہ چینی شروع کی اپنے حقوق کے باب میں صدائے احتجاج بلند کی ہوم رول سلف گورنمنٹ یا سواراج کا تخیل سب سے پہلے علم مغربی سے آشنا دماغ میں آیا۔ حکومت خود مختاری کی صدا جس نے اپنے مُنھ سے نکالی اور ہندوستان کے رہنے والوں کو یہ سامعہ نواز نغمہ جس نے سُنایا وہ انگریزی دان ہندوستانی تھا۔ کانگریس جو سواراج کا سنگِ بنیاد ہے اس کی تاسیس اور پھر اس عمارت کی تعمیر و تکمیل جن ہاتھوں نے کی ہے وہ سب انگریزی خواں اور انگریزی داں ہیں۔ مسلمانوں میں جب علوم مغربیہ کا آغاز ہوا اور پھر ان میں بھی ایک تعداد

---

[1] تقریر بمقام امرتسر بتاریخ ۲۹ رجنوری ۱۸۸۴ء ("لیکچروں کا مجموعہ" ص ۱۸۴) بحوالہ سرسید کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے، طبع دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۸۷۔

[2] ماضی کے واقعات اس غرض سے فراہم کیے جاتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اُٹھائیں اور ان کی روشنی میں اپنے طرزِ عمل کو درست کرسکیں۔ ماضی کے واقعات قابلِ فخر بھی ہیں اور باعثِ عبرت بھی، جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ (ظہور الدین)

تعلیم یافتوں کی تیار ہوگئی تو احساس و تاثیر یہاں بھی ظاہر ہونے لگے لیکن افسوس ع

ہم اُبھرتے ہوئے جھونکے میں خزاں کے آئے

(النور، علی گڑھ ۱۹۲۱ء، ص ۱۹۲، ۱۹۳)

ڈاکٹر ایچ۔ بی۔ خان نے بھی اپنے مقالہ (تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان و قرارداد مقاصد) کے آغاز میں لکھا کہ: "لیکن جو قوم یا قومیں تھکن، اضمحلال اور ناکامی سے صرف اس قدر سبق لیتی ہیں کہ ذرا تھوڑا آرام کرنے کے بعد پھر قوائے مضمحل کو تر و تازہ کر کے اور پھر سرگرم عمل ہو جائیں وہ نہ مردہ ہوتی ہیں اور نہ گمنام و بے صدا، بلکہ وہ اپنی تھکاوٹ اور پس ماندگی کے زمانہ تک آرام کر کے تر و تازہ اور ہشاش بشاش ہو کر حوصلہ، عزم، استقلال، جرأت اور مردانگی کے ساتھ اٹھتی ہیں اور پھر اپنی عظمت رفتہ اور چھینے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہیں"۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالہ سے بات ذرا آگے نکل گئی، تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ۱۸۹۰ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ہندوؤں کی کانگریس کی طرح مسلمانوں کی ایک اہم جماعت کے طور پر متعارف ہوگئی تھی، جس کی بدولت علی گڑھ مسلمانوں کی ہر طرح کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی علم افروز سرگرمیاں اہل علم کی نظر میں:

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اسلامیانِ ہند کی پس ماندگی کا ادراک کرتے ہوئے ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں مسلم گرلز اور مسلم بوائز اسکولوں کا جال بچھا دیا، اسلامیہ کالج بھی قائم ہونے لگے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تعلیمی میدان میں بھی مسلمان، ابنائے وطن سے بہت پیچھے تھے۔ جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس وقت تک مسلمانوں کی حالت نہایت ابتر تھی، کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند زوال پزیر[1] ہونا شروع

---

[1] "زوال پزیر قوم جبکہ وہ ماضی میں اقبال مند اور صاحب اقتدار و اختیار رہی ہو، تو انحطاط کے دور میں اس کی تمام تر علمی، فنی، صنعتی و حرفتی، سائنسی، زراعتی، تجارتی، معاشرتی اور معاشی اور دیگر اس قسم کی ترقی و خوشحالی ماند پڑ جاتی ہے، تو وہ مضمحل اور مایوس ہو کر دوسری اقوام کی ترقی و خوشحالی کی طرف مائل ہو جاتی ہے"۔ (ایچ۔ بی۔ خان، ڈاکٹر: "تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان و قرارداد مقاصد"، ص اوّل)

ہو گئے اور اغیار کی محکومیت اختیار کر کے وہ بے شمار معاشی، سیاسی، اقتصادی، تمدنی، ثقافتی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ مرحوم ضیاء الدین اصلاحی علی گڑھ تحریک پس منظر اور پیش منظر کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

'۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد جب مسلمان بے شمار مشکلات و مصائب میں گھر گئے تو انہیں تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے علی گڑھ تحریک وجود میں آئی۔ اس کا مقصد ان کی 'نشاۃ ثانیہ' اور ہر شعبۂ زندگی میں اصلاح وانقلاب برپا کرنا تھا چنانچہ مسلمانوں کی مذہبی سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے'۔ [۲]

سر سید نے تعلیم کو ان تمام روگوں کا علاج سمجھا۔ مولانا سلیمان اشرف نے اپنے لکچر میں مسلم معاشرہ میں درآنے والی ان خرابیوں کا ذکر بھی کیا ہے اور علم کے اُجالے سے ان کے تدارک کی سعی انجام دی ہے۔ جناب آزاد بن حیدر 'تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سر سیدؒ سے قائد اعظمؒ تک' میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پس منظر میں یوں رقمطراز ہیں:

---

[۱] 'ہندوستان سے مسلمانوں کی سلطنت جب زائل ہوئی اور ۵۷ء کے واقعہ نے ان کی آنکھیں کھولیں تو انہیں معلوم ہوا کہ سلطنت کے ساتھ کمالات ومحاسن بھی ان سے رخصت ہو گئے۔ جب اپنی سلطنت علومِ اسلامیہ کی حمایت وحفاظت کے لیے نہ رہی تو ترقی کے سارے زینے ٹوٹ گئے اور مسلمانوں کے علوم وفنون کی عمارت منہدم ہو گئی۔ جب سلطنت جاتی ہے تو محاسن وکمال صرف اُس قوم سے رخصت ہی نہیں ہو جاتے بلکہ کافی مدت کے لیے اُسے دامِ حیرت میں ایسا گرفتار کر جاتے ہیں کہ وہ قوم اس انقلاب کلی سے متاثر ہو کر عالمِ سراسیمگی میں ششدر و حیران ہوتی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا'۔ (محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا۔ ''النور'' ص۱۸۴،۱۸۵)۔ '۱۸۵۷ء کا طوفان آیا تو یہ ریت کے تودے ذروں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئے، نہ سیاسی وحدت کا وجود رہا اور نہ کوئی ملی جمعیت کا نشان، حکمراں طبقے انقلاب کی بھینٹ چڑھے، آبرو والے بے آبرو ہو گئے، دوسروں نے نئے آقاؤں کی غلامی کا جُوا پہنا، مسلمان قوم مر گئی گو مسلمان کروڑوں کی تعداد میں چلتے پھرتے نظر آتے رہے۔ سر سید احمد خاں نے نئے سرے سے قوم کو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ کروڑوں مسلمان صرف بے جان اور بے روح ہی نہ تھے بلکہ ان میں کوئی جماعتی شعور بھی باقی نہ رہا تھا'۔ (محمد سرور۔ 'مضامین محمد علیؒ': مقدمہ، صفحہ الف)۔

[۲] معارف، اعظم گڑھ (بھارت) شمارہ ۵، جلد ۱۴۷۔ مئی ۱۹۹۱ء، مشمولہ: مقالہ 'سر سید اکادمی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا سیمنار'، ۲۹/ اپریل تا یکم مئی ۹۱ء، ص ۳۸۴

'برعظیم پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے بعد سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ اور احیائے نو کے لیے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ اس کالج کے قیام کے پس پردہ یہ مقاصد تھے کہ یہ کالج مسلمان نوجوانوں کو جدید تعلیم و تربیت سے آراستہ کرے اور یہاں پر طلبہ کو ہر طرح کی سہولتیں میسر ہوں اور یہ کالج طالب علموں میں انقلابی اور سیاسی شعور پیدا کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کرتا رہے۔ اس کالج کے قیام کے بعد انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بھی قائم کی۔ اس کانفرنس کے ہر سال اجلاس منعقد[1] ہوتے اور ان اجلاسوں میں وہ اپنے مسائل اور سیاسی صورتِ حال پر بھی بحث کرتے تھے۔ گویا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانانِ برعظیم کے لیے ایک موثر اور عمدہ اسٹیج تھا کہ جہاں سے وہ اپنے حقوق کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔'[2]

مزید لکھا گیا ہے:

'ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیمی انجمن 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' تھی۔ جبکہ تحریک علی گڑھ نے قوم میں جوش و خروش پیدا کیا جس کی مثال انیسویں صدی میں ملنا مشکل ہے۔ اس تحریک میں جن سربرآوردہ شخصیتوں نے سرسید کا ساتھ دیا،[3] ان کے نام یہ ہیں: نواب محسن الملک (اصلی نام مہدی علی خاں

---

[1] 'آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۷؍دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں ہوا۔ کئی اجلاس منعقد ہوتے رہے ایک سالانہ اجلاس ہز ہائی نس سر آغا خاں کی صدارت میں دہلی میں ۲۷؍دسمبر ۱۹۰۲ء سے ۴؍جنوری ۱۹۰۳ء تک ہوا۔ اجلاس کے ممبروں کی تعداد ۱۰۳۶۱ اور وزیٹروں کی تعداد ۳۱۰ تھی جنھوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ (پنجاہ سالہ تاریخ، ص ۸۸۔۸۹) اس وقت تک کانفرنس کے تین شعبے تعلیم نسواں، تعلیمی مردم شماری اور مدارس تھے۔ دہلی اجلاس میں تین مزید شعبے سوشل ریفارم، ادبی شعبہ، امور متفرقات شامل ہوئے'۔ (محمد معروف، سید۔ مضمون 'انجمن ترقی اردو، مختصر تاریخی جائزہ'، مشمولہ: رسالہ ادب و کتب خانہ، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۴۱)

[2] تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیدؒ سے قائداعظمؒ تک: آزاد بن حیدر، طبع اول۔ کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۸

[3] مولانا ابوالکلام آزاد نے سرسیدؒ اور ان کے مصاحبین کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا: 'مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا، بل کہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے

(باقی برصفحہ آئندہ)

ہے)، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، نذیر احمد، مولوی زین العابدین، محمد اسمٰعیل خان، الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد ان کے ساتھی ان کے کام کو جاری رکھتے ہوئے آل انڈیا سیاسی تنظیم بنانے کی مسلسل کوششیں کرتے رہے جس کی وجہ سے مسلمان راہنما ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔[۱]

سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے مذکورہ بالا حضرات کی تحریریں، مضامین اور تقاریر جو تہذیب الاخلاق وغیرہ میں شائع ہوئیں وہ اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ تعلیمی کانفرنس کے اجلاسوں میں پڑھے جانے والے خطبات (اور ان میں پاس ہونے والی قراردادیں) جو چالیس بیالیس سالوں پر محیط ہیں ۱۹۲۷ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی تحریک پر مولوی انوار احمد صاحب زبیری (مارہروی) نے خطباتِ عالیہ کے نام سے تدوین و ترتیب دیے۔ یہ خطبات علی گڑھ سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام شائع ہوئے۔ خطبات کے مقدمہ میں مولانا محمد اکرام اللہ خاں ندوی[۲] شاہجہانپوری (م: ۱۹۵۲ء) لکھتے ہیں: 'ابتدا میں لوگ زیادہ تر سرسید، نواب محسن الملک، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد

....

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور ان کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابل ذکر اہل قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقہ کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں'۔ (حوالہ: سرسیّد کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے از پروفیسر خلیق احمد نظامی، طبع بھارت۔ ۱۹۹۳ء، ص ۳۰ اور ۱۴۷، ۱۴۸)

۱۔ تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیدؒ سے قائد اعظمؒ تک، ص ۸۳، ۸۴

۲۔ بقول مولوی انوار احمد زبیری، مولانا اکرام اللہ خاں ندوی عربی ادب کے ذوق آشنا اور زبان اردو کے پختہ کار ناثر (مضمون نگار) ہیں۔ مولانا سلیمان اشرف نے ۱۹۲۴ء میں جب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نصاب تعلیماتِ اسلامیہ کے لیے تجاویز مرتب کیں، تو ندوی صاحب موصوف نے اس کی تحسین کی اور عربی علم ادب کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے اُسے مفید و منفعت رساں قرار دیا۔ (السبیل: ۳۰)

اور علامہ شبلی جیسے یگانۂ روزگار مشاہیر کے دیکھنے اور اُن کا لکچر یا کلام سننے کے لیے آتے تھے......
۱۸۹۳ء میں جب کانفرنس کا آٹھواں اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا اور نواب محسن الملک صدر منتخب ہوئے تو خطبہ صدارت میں ایک خاص وسعت وشان پیدا ہو گئی۔ یہ (گزشتہ اجلاسوں کی نسبت) سب سے پہلا خطبہ تھا جس میں زورِ بیان اور جوش پایا جاتا ہے اور انشا پردازی کی ایک خاص جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً نواب صاحب ایک موقع پر نکتہ چینوں کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

"مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم وتربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا۔ مانا کہ ہم نے کانفرنس قایم کر کے مسلمانوں کو بہکایا، مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لیے یہ بتادیں کہ اُنھوں نے اپنی قوم کے لیے کیا کیا، اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے لیے دیر وکنشت بنایا، مانا کہ گناہ کیا۔ مگر یہ فرمایئے کہ اُن کا بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے جہاں جا کر ہم سجدہ کریں؟ اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے ایک قومی کانفرنس قایم کی، ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا۔ مگر ہمارے دوست براہ مہربانی یہ فرمادیں کہ اُنھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے پر کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جا کر نوحہ کریں اور سر پیٹیں؟ ہم اگر مضر یا بے سود کام کرنے کے گنہ گار ہیں، تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے۔

گر بر سرِ تو گشتن و بُردن گناہِ من — دیدن ہلاک ورحم نہ کردن گناہ کیست
گیرم کہ وقتِ ذبح طپیدن گناہِ من — دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست"[1]

محمد سرور مرحوم (استاذ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ) فرماتے ہیں:

---

[1] آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ صدارتی خطبات (۱۸۸۶ء۔۱۹۰۶ء) مرتبہ آغا حسین ہمدانی۔ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد۔ ۱۹۸۶ء، ص ۸۴۔۸۲

"سرسید ہماری قوم کی ملی زندگی کے خالق ہیں[1]، ان کے جانشینوں نے اپنے مرشد کے بتائے ہوئے رستے پر بڑے خلوص اور سرگرمی سے قوم کو چلایا، محسن الملک اور وقار الملک نے مدرستہ العلوم اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعے ہم میں زندگی کا احساس اور جمعیت اور مرکزیت کا شعور قوی کیا۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے اسلامی ہند کے مردہ جسم میں تازہ خون زندگی دوڑا اور ملتِ اسلامیہ نے نیا جنم لیا"[2]

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام (آل انڈیا مسلم لیگ کی پیش رو):

سیاسی سطح پر مسلم لیگ کے قیام سے پہلے مسلمانانِ ہند بجا طور پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہی کو سب سے بڑا سیاسی پلیٹ فارم سمجھتے تھے۔ مسلمان زعما و اکابر اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں شامل ہوتے رہے اور اپنا عملی کردار بھی ادا کرتے رہے۔ بالفعل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے آل انڈیا کانگریس کے مقابلے میں اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب ہندی اردو[3] تنازع شروع ہوا تو ایجوکیشنل کانفرنس کے زعما نے مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ سیاسی جماعت بنانے پر غور و خوض شروع کر دیا تھا۔

....

[1] "اگر سید احمد خاں مرحوم و مغفور مسلمانوں کو دوبارہ علمی ذوق اور جستجو سے آشنا نہ کرتے تو یہ ملک جس میں ہم آزادی کا سانس لے رہے ہیں اس کا قیام ناممکن ہوتا۔ نہ ہمارے پاس اقبال ہوتے نہ جناح۔ نہ ہمیں اپنے ماحول کا فہم ہوتا نہ ہم بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کے تقاضوں کو سمجھ سکتے چہ جائیکہ اپنے ملی مفاد کا تحفظ کر سکیں۔ بالاکوٹ اور دہلی کی شکستوں کے بعد اگر کسی چیز نے ہماری گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا تو وہ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک تھی۔ علی گڑھ نہ ہوتا تو پاکستان بھی نہ ہوتا...... پاکستان کی بنیاد ایک تعلیمی تحریک پر ہے اور ایک تعلیمی تحریک ہی اسے قوت اور عظمت بخش سکتی ہے"۔ (ممتاز حسن، ڈاکٹر "مقالاتِ ممتاز" مشمولہ "تعلیم: ایک ناگزیر فریضہ"۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۲۸۰)

[2] محمد سرور، پروفیسر۔ مقدمہ: "مضامین محمد علی"۔ مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۳۸ء، صفحہ ب

[3] ہندوؤں کی جانب سے اُردو کے خلاف یہ تحریک علمی و ادبی کے بجائے ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد وحید ہندوستان سے مسلم تہذیب کی تمام نشانیوں کو یکسر ختم کرنا تھا۔ مسلمانوں کی الہامی کتاب قرآن کریم کے ساتھ خود ہندو کانگریسی لیڈر مسٹر گاندھی کی دشمنی اس حد تک تھی کہ وہ کہتے تھے "میں اردو بھاشا کا اس لیے مخالف ہوں کہ اس کے اکثر الفاظ قرآنی بھاشا میں ہیں"۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں مسلم ایجوکیشنل کا بیسواں سالانہ اجلاس نواب مشتاق حسین وقار الملک (۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء - ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شرکائے کانفرنس میں بحث و مباحث کے بعد اجلاس کے مندوبین کی اس تجویز کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک علاحدہ سیاسی جماعت ہونی ضروری ہے۔ لہٰذا اس اجلاس میں اتفاق رائے سے آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام یعنی دسمبر ۱۸۸۵ء کے بعد سے مسلمانوں کی سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ نواب وقار الملک نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اوّلین تاسیسی اجلاس میں اپنے صدارتی خطاب میں یوں اظہار فرمایا:

'آنرایبل نواب خواجہ سلیم اللہ خان بہادر اور دیگر حضرات! آج جس غرض سے کہ ہم لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ کوئی نئی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان میں جس وقت سے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی ہے، اس وقت سے وہ ضرورت بھی پیدا ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ سر سید مرحوم و مغفور نے جن کی عاقبت اندیشی اور عاقلانہ پالیسی کے مسلمان ہمیشہ مشکور و ممنون ہیں۔ نیشنل کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہوکر نہایت زور کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی بہتری اور حفاظت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کانگریس میں شریک ہونے سے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

تاہم علی گڑھ تحریک سے بقول ضیاءُ الدین اصلاحی، علم و ادب کا فروغ اور اردو زبان کی مفید خدمت انجام پائی۔ سرسید، نواب محسن الملک اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اردو زبان کے تحفظ و بقا کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ ۱۹۰۳ء میں اردو کی ترویج و ترقی اور حفاظت کے لیے 'انجمن ترقی اردو' کا قیام عمل میں آیا۔ یہ انجمن، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی ایک شاخ تھی، جو آگے چل کر خود ایک بار آور درخت بن گئی اور تاریخ و تہذیب اور مسلم زبان اور کلچر کے ارتقا میں اس انجمن نے اہم کردار ادا کیا۔ (حصول پاکستان، ص ۱۵ اور ششماہی الایام، کراچی، جنوری۔ جون ۲۰۱۴ء، ص ۲۹)۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف 'ہندی اُردو تنازع (ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں)' شائع کردہ نیشنل بک فاؤنڈیشن دیکھی جاسکتی ہے۔

باز رکھیں[1]، اور یہ رائے اس قدر صائب تھی کہ گو جناب مرحوم آج ہم میں نہیں ہیں، لیکن مسلمانوں کی عام رائے اس وقت وہی ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے، ہم کو اس بات کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت میں بیش از بیش اہتمام کریں'۔[2]

پروفیسر احمد سعید نے اپنی کتاب ''انجمن اسلامیہ امرتسر'' میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے باب میں لکھا ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم کا قیام اگرچہ خالصتاً تعلیمی مقاصد کے لیے عمل میں آیا تھا[3]، لیکن اسی پلیٹ فارم سے سرسید نے کانگریس کے خلاف تقاریر کیں اور اسی پلیٹ فارم سے مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ

۱؎ 'مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین شروع سے اب تک یہ اختلاف چلا آ رہا تھا کہ کانگریس چاہتی تھی کہ پورے ہندوستان پر اس کا اقتدار ہو۔ وہ جس قسم کا قانون چاہے وضع کرے۔ تمام اقلیتیں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ دستورِ حکومت ایسا ہو جس میں مسلمانوں کو اپنے کلچر، زبان، تہذیب و تمدن، مذہب وغیرہ جیسے اہم معاملات میں پوری آزادی ہو اور وہ حکومت میں شریک ہو کر اپنی ملت کے حقوق پورے کرا سکیں'۔ (بدایونی، عبدالحامد قادری، مولانا۔ ''خطبۂ صدارت۔ پاکستان کانفرنس'' مورخہ ۳۰ر اگست ۱۹۴۱ء منعقدہ رائے کوٹ ضلع لودھیانہ، مطبوعہ نظامی پریس۔ بدایوں، ص ۲۳)

۲؎ 'تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیدؒ سے قائداعظمؒ تک' مرتبہ آزاد بن حیدر، ص ۱۱۰۔

۳؎ 'ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے بقول، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دراصل کانگریس کا ردِ عمل تھی۔ سرسید احمد خان نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندوؤں کی طرح سے مغربی طرز سے اپنی زندگیوں کو ڈھال لیں اور برطانوی حکام کے تحت سیاست میں حصہ لیں، کیونکہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ سیاست میں کس طرح سے حصہ لیں، لہٰذا بہتر یہی تھا کہ سیاست میں حصہ نہ لیا جائے۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے قومی تقاضوں کے تحت مغربی تعلیم کا انتظام کیا۔ بنگال سے لے کر سرحد اور پنجاب سے دکن تک کے مسلمانوں کو اپنی قومی اور اجتماعی تعلیم و ترقی کا احساس ہو گیا اور اسی بیداری کے نتیجہ میں آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا'۔ (ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا انٹرویو بمقام ان کی رہائش گاہ A-592, Block-J, North Nazimabad, Karachi بروز جمعرات مورخہ ۱۵ر نومبر ۲۰۱۲ء از کہکشاں ناز بحوالہ ششماہی الایام، کراچی، جنوری۔ جون ۲۰۱۴ء، مشمولہ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں سید الطاف علی بریلوی کی خدمات (۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۰ء)۔

معرضِ وجود میں آئی۔[1] ہمارے عہد کے مستند دانشور خواجہ رضی حیدر کی رائے ہے کہ مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کرنے میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بہت مفید ثابت ہوئی۔[2]

مسلم لیگ کو بلاشبہ بہ حیثیت جماعت بلکہ تحریک، پاکستان بنانے کا منفرد اعزاز حاصل ہے، لیکن یہ بھی مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسلم لیگ نے بالفعل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بطن سے جنم لیا، تو پھر اس کے فعال کردار کا اعتراف کیوں نہ کیا جائے۔

وابستگانِ علی گڑھ کا مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے ساتھ والہانہ تعلق خاطر

آج اگر مورخین اس حقیقت کے معترف نظر آتے ہیں کہ تحریک پاکستان کو عملاً دست و بازو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ نے عطا کیے تو اس کا کامل ادراک اس وقت بھی علی گڑھ والوں کو بصمیمِ قلب و جاں تھا۔ اور وہ بالفعل اپنے خونِ جگر سے اس ملی تحریک کی آبیاری میں جتے رہتے تھے۔

آیئے رسالہ سہ ماہی علی گڑھ جلد ۲۲، شمارہ نمبر ۱، ۱۹۴۶ء کا ایک شذرہ ملاحظہ فرمایئے۔

”علی گڑھ ہندوستان میں مسلم قوم کا سرچشمۂ فکر و عمل اور ان کی ملی زندگی کا آئینہ ہے۔ اس چند مربع میل سرزمین میں دس کروڑ انسانوں کی روح اور قلب و ذہن کی پہنائیاں بند ہیں۔ یہیں پہنچ کر ہندوستان کے ”مردِ بیمار“ کو پہلی بار امید کی کرن نظر آئی اور ”خونِ صد ہزار انجم“ سے نمودِ سحر کے آثار پیدا ہوئے یہیں سے تعلیمی اور مابعد معاشرتی اصلاح کا دور شروع ہوا اور یہیں سے اور یہیں کی اصلاحات کے بطن سے ۱۹۰۶ء میں سیاست نے مسلم لیگ کی شکل میں جنم لیا۔ یہیں سے خلافت کی آواز اُٹھ کر پورے ہندوستان میں گونجی اور یہیں کے مجاہدوں نے اُس نازک وقت میں جناح کے گرد جمع ہو کر مسلم قوم کو بچالیا، جب کانگریس اسے اپنے میں ضم کر لینا یا بالفاظِ دیگر اس چراغ کو اپنے دامن میں چھپا کر گل کر دینا

---

۱ انجمن اسلامیہ امرتسر (۱۸۷۳ء۔۱۹۴۷ء) تعلیمی و سیاسی خدمات از احمد سعید، مطبوعہ ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۶۳۔

۲ قائداعظم کے ۷۲ سال، سورتی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۔

چاہتی تھی۔ جہاں کی یہ تاریخ ہو وہاں یہ کس طرح ممکن تھا کہ قوم پر آزمائش کا وقت آ پڑے اور خاموشی رہے۔ چناں چہ جب ہنگامہ انتخابات شروع ہوا اور قوم کو ضرورت ہوئی تو یہاں کے فرزند قوم کے مفاد پر اپنے مفاد، اور قوم کے مستقبل پر اپنے مستقبل کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہزاروں اسرافیل لے کر اُٹھے اور موت کی سی نیند سونے والوں کو بھی جھنجوڑ جھنجوڑ کر اُٹھا دیا۔ قریوں قریوں پھرے اور گلیوں گلیوں کی خاک چھانی کہیں صرف اپنی جیب کے چنوں پر گذارا کیا اور کہیں کڑکڑاتی سرد راتیں اپنی سیاہ شیروانیوں کے سہارے کھلے میدانوں میں گذار دیں۔ مشکل سے ہندوستان کا کوئی ایسا مسلم آباد گوشہ ہو گا جہاں ان کے قدم نہ پہنچے ہوں اور موذن کی صداؤں سے آشنا کم ایسی بستیاں ہوں گی جہاں ان کی آواز نہ گونجی ہو۔ کہیں کہیں تیس تیس، چالیس چالیس میل کی مسافت بیک وقت پیادہ پا طے کی اور کہیں بیمار پڑے تو غربت و کس مپرسی میں بھی اپنے رفیقوں کو حکم کار دے کر رخصت کر دیا۔ بالآخر اس جذبۂ ایثار و خلوص عمل کو کامل فتح ہوئی اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مسلم لیگ مسلم قوم کا پیکر اور پاکستان اس کی روح ہے۔" [1]

علی گڑھ کا طلبہ محاذ قائداعظم کی نظر میں

علی گڑھ والوں کی تحریک پاکستان اور قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ محبت یک طرفہ یا محض وقتی جذبات کی آئینہ دار نہ تھی۔ نہ ہی یہ چاہت اور خلوص یک طرفہ تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کو نوجوانان علی گڑھ کی محبت کا حد درجہ پاس تھا اور وہ اپنے ان جاں نثاروں کی دل جوئی اور سرپرستی کو اپنے اوپر لازم جانتے تھے۔ ذیل میں ان کے خیالات کی ترجمانی کرتی ایک تحریر دیکھیے۔

"علی گڑھ میری تحریک کا مرکز ہے، یہیں سے میرے نوجوان سفیر برِاعظم ہندوستان کے ہر کونے میں جا کر مسلمان عوام کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ ان کا مشنری

---

[1] سہ ماہی 'علی گڑھ میگزین' ۱۹۴۶ء۔ اداریہ شذرہ بعنوان: مادرِ درس گاہ، صفحہ ط اور ی۔

جذبہ اور تحریک سے بے لوث لگاؤ ہی میری ساری متاع ہے۔ میں علی گڑھ دس کام چھوڑ کر آتا ہوں اور ان بچوں کی صحبت میں بیٹھ کر اور ان سے باتیں کر کے اپنے عزم اور ارادے میں تقویت حاصل کرتا ہوں۔"[1]

تحریک پاکستان کے سنگ ہائے بنیاد میں ایک اہم ترین نام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

پاکستان کے تخیل کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لیے جو جاں گسل اور پیہم جدوجہد ہمارے اکابر نے کی، اس سعی جمیل میں ایک اہم ترین کارنامہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود میں لانا ہے۔ اس کتاب کے مختلف ابواب میں انتہائی شرح وبسط کے ساتھ اس ادارہ کی اہمیت و افادیت اور گراں قدر خدمات کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں جہاں جہاں سے بھی کوئی قابل ذکر اور قابل قدر مواد میسر آیا اسے کتاب کا حصہ بنایا گیا کہ قارئین کرام زیادہ سے زیادہ تاریخی حقائق تک رسائی حاصل کرسکیں۔

حُسن اتفاق سے جناب افضل عثمانی کا ایک مفید اور مستند مقالہ ہمارے ہاتھ آیا، جو ہم من و عن بزبان انگریزی ہی شامل کتاب کر رہے ہیں۔

---

[1] "علی گڑھ اور تحریک پاکستان": نواب مشتاق احمد خاں، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۶۹ء بحوالہ کرامت علی خاں: "جہادِ آزادی (منتخب مقالات)" طبع لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۲۔

All India Muslim Educational Conference
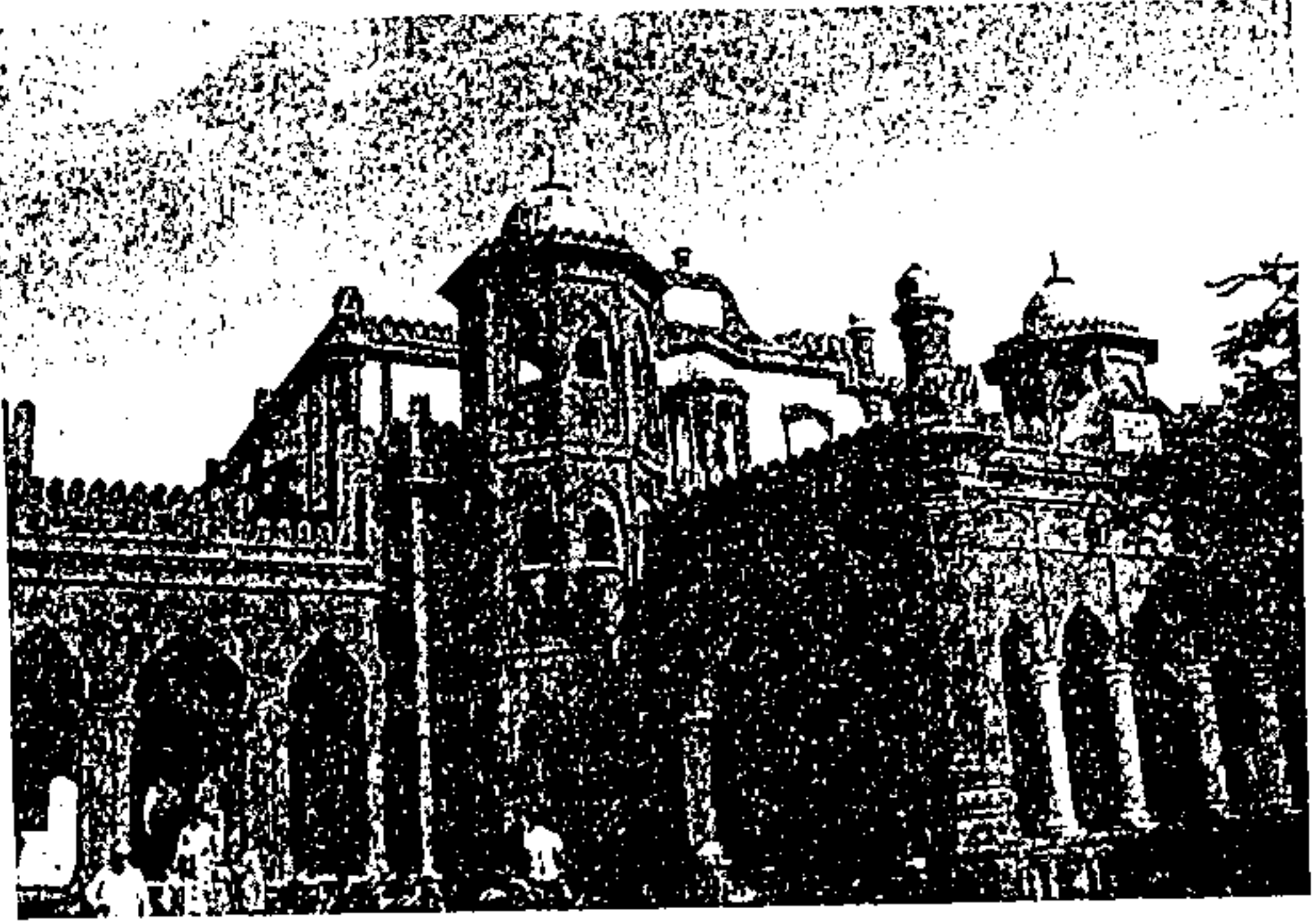
سلطان جہاں منزل (مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) کا اندرونی منظر
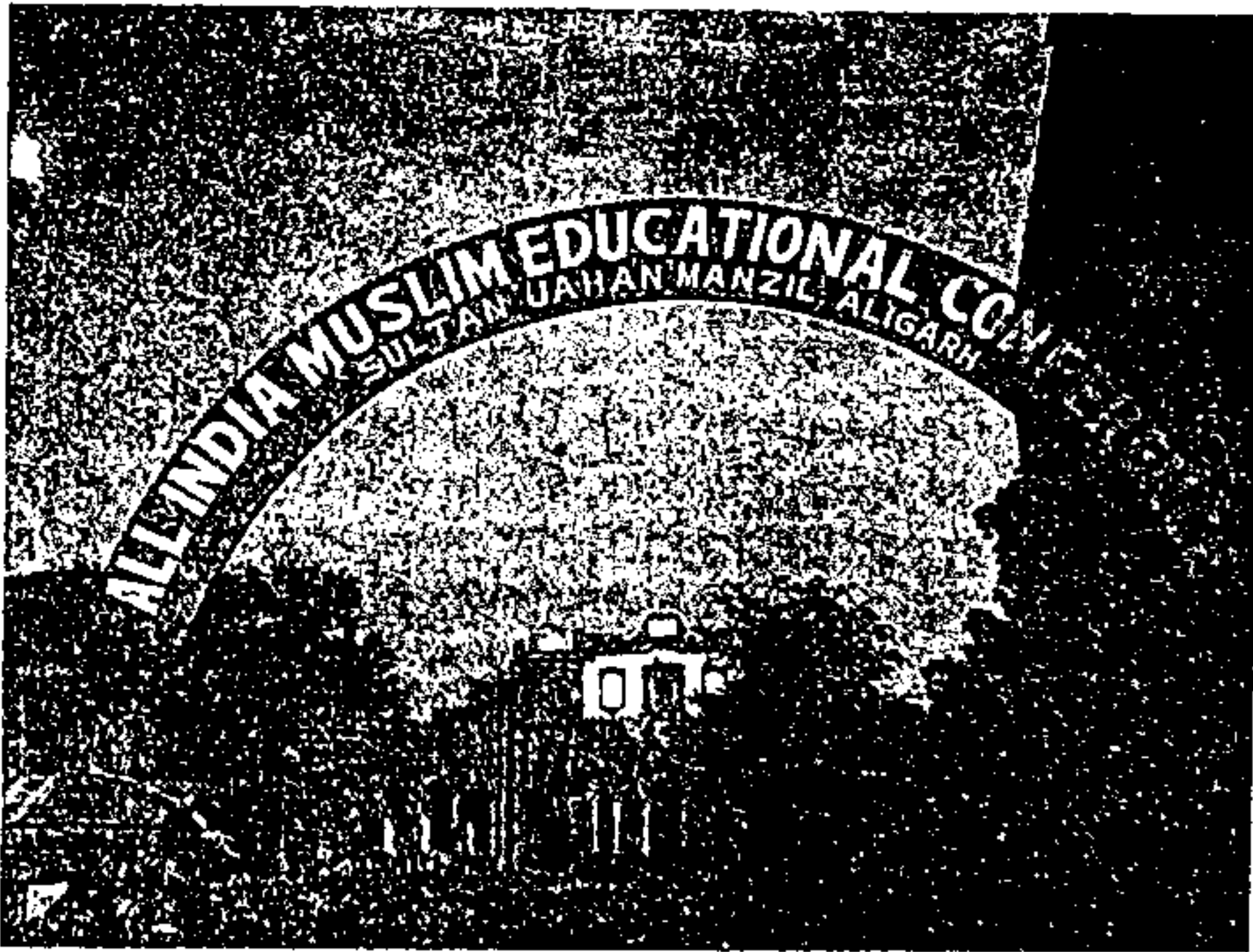
All India Muslim Educational Conference Head Office (Sultan Jahan Manzil, AMU Aligarh India)

By Afzal Usmani

All India Muslim Educational Conference (AIMEC), a Non-political organization which brought Muslim rulers of remaining princely states of undivided British India, social and political leaders, intellectuals and distinguished people from all of walks of life onto one platform for educational empowerment of Muslims of India and transformed the dimensions of Aligarh Movement and fulfilled the dream of its founder, Sir Syed Ahmad Khan by converting Muhammadan Anglo Oriental College (M.A.O. College) to Aligarh Muslim University. The Conference also became championing the cause of Women's education and gave birth to one of the oldest and biggest women's educational institution, Women's College of Aligarh. This non-political, All India Muslim Educational Conference which was started for educational empowerment of Muslims of India also gave birth to largest Muslim political party "Muslim League" which still has roots in all the 3 countries of British India, Pakistan, Bangladesh and India. This one time conglomerate of Muslim Intelligentsia of British India has lost its glory and living or dying quietly in a monumental and historical building

"Sulatn Jahan Manzil" in Aligarh Muslim University campus. The only time we hear its name when it sends 5 representatives to Aligarh Muslim University supreme governing institution AMU Court or get a peek into its symbolic lowest possible subscribed Journal, "Conference Gazette". Let's have a look, what was All India Muslim Educational Conference.

The inauguration of first Session of Indian national Congress at Bombay on 28-31 December 1885 by Allan Octavian Hume was a turning point in social and political movements of British India. Indian National Congress chooses a path of confrontational politics with the rulers of British India which was against the philosophy of Sir Syed Ahmad Khan, who was a strong supporter of Co operational Politics with British Empire. This lead Sir Syed to establish Mohammadan Educational Congress on 27th December, 1886 at Aligarh. By this time Sir Syed was undisputed well wisher of Muslims of India and had unquestioned secular credentials. Sir Syed's decision not to participate in Indian National Congress surprised a lot of intellectuals of the time. But Sir Syed was very clear in his mission of Muslim upliftment and at any cost he did not wanted to see the wrath of British Empire on Muslims of India which he had himself witnessed after 1857 revolt and so he choose the path of Co operational Politics with the rulers of India. This Congress became Mohammadan Educational Conference in the annual session of 1890 at Allahabad. This organization was a key element of Aligarh Movement and played an important role in taking the Aligarh Movement across the Indian Sub-continent and the establishment of Aligarh Muslim University. It is an established fact that the foundation of AIMEC was to keep Muslims of India away from a confrontational politics of Indian National Congress against British Empire and to do so it was made very clear that AIMEC is socio-political group to promote education among the Muslims of Indian subcontinent. One of the demands of the INC was to have open competition for Civil Services. Sir Syed was convinced that Muslims of India are educationally not at par with their fellow countrymen and so can not compete in open competition with their fellow countrymen. Sir Syed and leaders of AIMEC made it very clear that AIMEC is neither against INC or other political groups of India nor intended to alienate Indian Muslims from main stream political process but to promote education among the Muslims of Indian subcontinent to bring them at par with their fellow countrymen. In the Inaugural session of Muslim Educational Conference on 27th December, 1886 at Aligarh, Sir Syed emphasized his philosophy of co operational politics with the rulers of India and put forward the need of educational

empowerment for the Muslims of India. Indian National Congress leaders were not very happy with the formation of Muslim Educational Conference.

Muslim Educational Conference was concern primarily with Muslim education. It kept a vigilant eye on the spread of modern education among Muslims and passed resolutions and took steps to deal with the factors which were hindering its progress. Muslim Educational Conference became a platform for Indian Muslim Intelligentsia to mobilize Indian Muslim masses to promote education and specifically modern and western education and clear their doubts and misconception about the western and modern education. The Conference was much more than a gathering of Muslim Educationist and gave an opportunity to Aligarh Movement leaders to promote Aligarh Movement. Principal Theodore Beck and Prof. Theodore Morrison also took keen interest in Conferences activities. Sir Syed Ahmad Khan was elected as Secretary of the newly formed organization. The Conference was a powerful instrument of Intellectual awakening and general spread of knowledge amongst the Muslims of India.

The life of All India Muslim Educational Conference can be broadly divided in five phases or periods;

1. 1886-1898 : Sir Syed Period
2. 1898-1907 : Mohsinul Mulk Period
3. 1907-1917 : Sahabzadah Aftab Ahmad Khan Period
4. 1917-1947 : Nawab Sadar Yar Jang Period
5. 1947-till date : Post Independence period

1886-1898: Sir Syed Period:
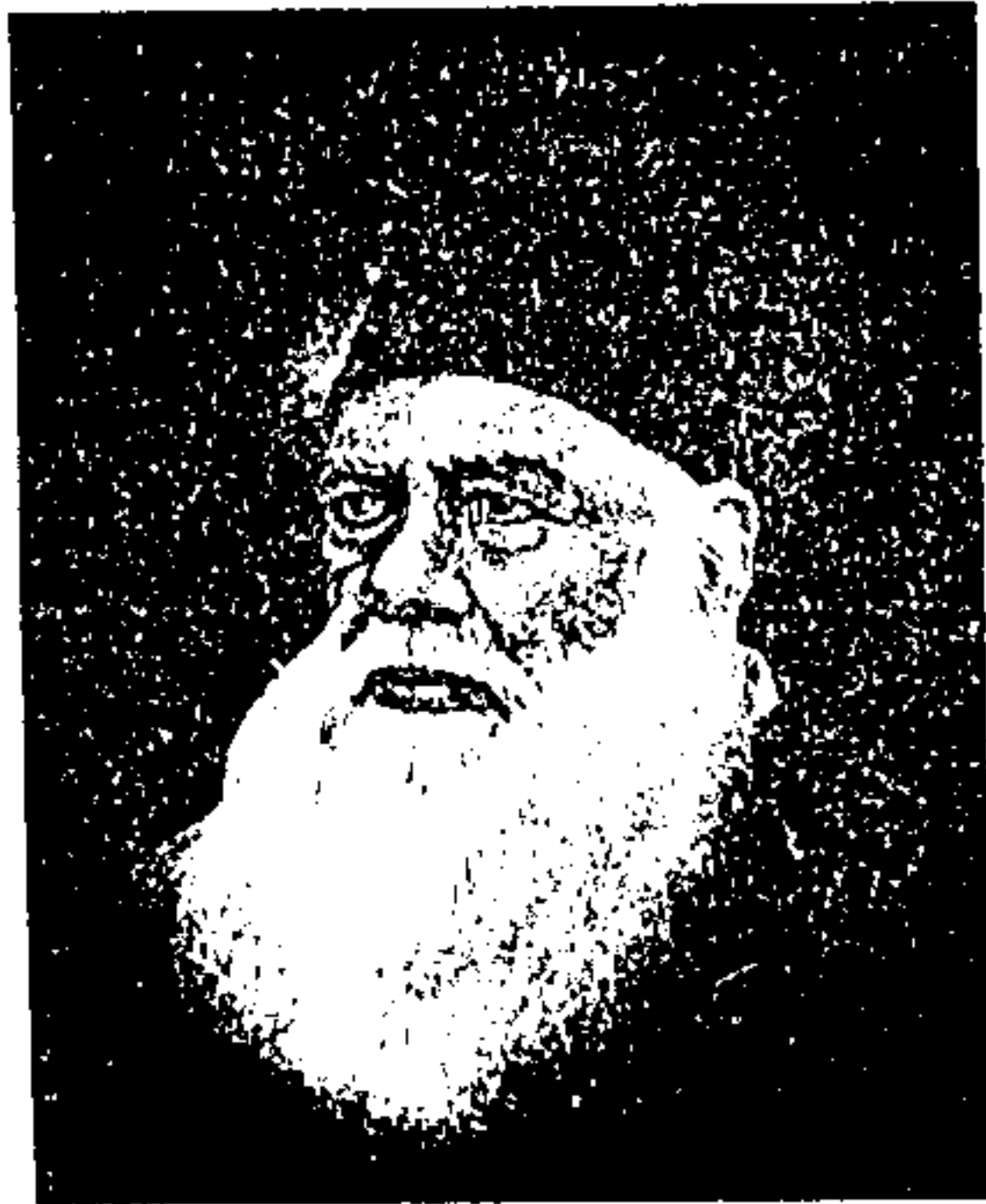
Zahoor

The Beginning a new Conglomerate of Muslims of India:

The first session of Muslim Educational Conference (AIMEC) was held at Aligarh. This inaugural session was presided over by none other than close friend of Sir Syed and one of the strongest supporters of Aligarh Movement, Maulvi Samiullah Khan. In this session, Sir Syed Ahmad Khan was elected as Secretary of the newly formed organization. The Inaugural session at Aligarh adopted the following resolutions;

1. Establishment of "AIMEC" and to hold its annual session in different parts of the country.P
2. British Government should only take care of modern and western education. Muslims will take care of Oriental studies.
3. Promote publications of journals and special attention should be paid for memorization of Quran (Hifz-e-Quran)
4. The Head Office of Muslim Educational Congress will be at Aligarh.

The second session of The Congress was held at Lucknow and was presided over by Mr. Imtiyaz Ali Khan of Kakori. The session adopted the following resolutions;

1. Scholarships will be awarded to Muslim students for higher education.
2. Local Educational Committees were formed.

The first two sessions of The Congress were focusing on education but the Third session which was held at Lahore in 1888 focused on social issues of Muslims of India. The session was presided by Sardar Muhammad Hayat Khan and the following resolutions were adopted;

1. Voice was raised against some heinous and Non-Islamic traditions among the Muslims and solutions were
discussed to curb these Non-Islamic and heinous traditions from the Muslim societies.
2. Request was made to the government for concessions and exemptions on tuition fees for poor Muslim students.
3. Oriental and religious education should be started in Government Schools.
4. An extra effort needs to put for promotion of women's education.

The Fourth session was held at Aligarh in 1889 and was presided over by Sardar Muhammad Hayat Khan and following points were discussed;

1. A passionate appeal was made to donate Zakat Money for the education of poor Muslim students.
2. Demands were made to remove derogatory and anti-Islamic contents from History course books.
3. Proposals were made to establish separate technical institutes.
4. Special attentions were paid towards the need to develop curriculum for toddlers and kids.

The Fifth session was held at Allahabad in 1890 and once again it was presided by Sardar Muhammad Hayat Khan. The major attraction of this session was the renaming of All India Mohammadn Educational Congress to All India Muslim Educational Conference. The other focus of this session was translation of literary works of different languages into Indian languages. The marching mode of this caravan of Muslim intellectuals of India was well received by the Indian Muslims and its resolutions and

proposals started showing some results. The Sixth session at Aligarh recognized appreciated the efforts of Shamsul Ulema, Allama Shibli Nomani for his writings "Al-Jizya (Security Tax for Non-Muslims in Islamic State), Al-Mamoon (Biography of Khalifa Mamoon Al-Rasheed) and Seeratun-Noman (Biography of Imam-e-Azam, Abu Hanifa) ". This session also recognized the need of women education for the overall development of Muslims of India. Some concrete steps were proposed to promote women education. Publication of "Conference Journal "was a baby of this Aligarh session. This historical session at Aligarh was presided over by Nawab Ishaq Khan, who later served as Secretary of Mohammadan Anglo Oriental College Management. The Sixth session was held at Delhi in 1892 and faced some stiff resistance from some local theologians. This session was presided over by Maulvi Hashmatullah Khan. This session was also addressed by M.A.O. College Principal, Prof. Theodore Beck and M.A.O. College Professor and well known Orientlist, Prof. Thomas Walker Arnold. The session of 1894 at Aligarh also made a passionate appeal to support the newly formed organization "Nadwatul Ulema".

In 1896, the annual last executive session of Muslim Educational Conference in Sir Syed Ahmad Khan's lifetime, made a proposal to start a women education section in Muslim Educational Conference was accepted and Justice Karamat Hussain was appointed as its Founding Secretary. Nawab Mohsinul Mulk, Sahabzada Aftab Ahmad Khan, Janab Sultan Ahmad and Haji Ismail Khan were asked to assist Justice Karamat Hussain. In the annual session of Muslim Educational Conference of 1898 in Lahore, a separate department of women's education was established and Sahabzada Aftab Ahmad Khan was elected its Secretary. This started a wrath from the traditional Muslims of India but a dedicated team of Janab Ummid Ali, Ghulam-us-Saqlain and Haji Ismail Khan wrote several letters and article in Aligarh Institute Gazette and other reputed journals to defend the decision of Muslim Educational Conference to start a women's educational movement. Justice Amir Ali presided over the annual session of AIMEC in 1899 at Calcutta and the idea to start girl's schools is all of the state capital was accepted. It was also agreed that the Ulema will be consulted to develop the curriculum of the schools and the modern subjects of Science and Social Science will also be included the syllabus. In the session of December 1902 in Delhi under the leadership of H.H. Sir Agha Khan, young Shaikh Abdullah was appointed as Secretary to look into the women's educational project and was asked to start the activities very aggressively. The year 1897 was a bit tough on AIMEC as could not held the annual session due to poor

health complication with Sir Syed Ahmd Khan and finally Sir Syed Ahmad Khan died on 27th March 1898 and the rein of All India Muslim Educational Conference were transferred to Saiyad Mehdi Ali, Nawab Mohsinul-Mulk. By this time AIMEC had became an effective and established platform and even the opponents of Sir Syed including Justice Amir Ali, Justice Badruddin Tayabji and many more had joined the AIMEC and had started attending AIMEC sessions in different parts of the Country. The Brirish staff of MAO College including Principal Theodore beck, Prof. T. Morrison, Prof. T.W. Arnold and others started supporting the AIMEC in India and started a campaign to generate support in England too.

1898-1907: Mohsinul Mulk Period:

The Beginning of Movement for a Muslim University and Birth of Muslim League:

The death of Sir Syed was a tragic event for Aligarh Movement and its leaders but to fulfill the mission of Sir Syed, his close confident and friend and one of the strongest supporter of Aligarh Movement, Saiyad Mehdi Ali, Nawab Mohsinul Mulk was elected as Secretary of M.A.O. College Management Committee as well as Honorary Secretary of All India Muslim Educational Conference. Colleges everywhere were feeling the pinch of the government's demands for higher fees and harder examinations. At Aligarh, the number of students fell from 595 in 1895 to 323 at the time of Sir Syed's death on 27 March 1898, and by the following July had plummeted to 189; and the situation was made worse by an embezzlement scandal in 1895, and by renewed attacks from Sir Syed's old collaborators who had broken with the college in 1889. The college accounts were in disorder, and as a result of embezzlement, the suspension of grants from a number of benefactors, and the fall in income from fees, the institution was heavily in debt. [6].

This was a very tough time for MAO College and Aligarh Movement but after taking over the rein of Aligarh Movement, Nawab Mohsinul Mulk gave a big boost to fulfill the dream of Sir Syed Ahmad Khan to convert M.A.O. College into a Muslim University and in the first session during his Secretary ship in 1898 at Lahore, he pushed forward the proposal of Muslim University. The proposal was prepared by Prof. T. Morrison and Maulvi Badrul Hasan. This session of AIMEC also put emphasis on moral education for youth and special attention were paid to promote women's education

The following proposals were made in the 12th session of AIMEC at Lahore, which was first session after the death of Sir Syed Ahmad Khan.

1. Proposal for a Muslim University.
2. Promotion of Women's Education.
3. Promotion of moral education for youths
4. Establishment of Muslim Hostels at Public or Private Institutions.

This session at Lahore was presided over by Nawab Fateh Ali Khan Qazalbash. The proposals for a Muslim university were fully discussed at this session at Lahore in December 1898. About 900 people attended and the Conference showed a new spirit of enterprise. Prof. T. Morison proposed that a Muslim university should be founded, observing that it would really be no more than an expanded version of Aligarh College. Beck reminded the audience that the University would be the Indian Muslims' passport to office. Badruddin Tyabji of Bombay, Sir Syed's old political antagonist, subscribed Rs. 2,000 to the university, and, from Calcutta, Syed Amir Ali pledged his support. In December 1899, the conference moved out of upper India and met in Calcutta under the presidency of Amir Ali. The Sir Syed memorial fund started a Bengal branch. The 1901 session of the conference took place in Madras. The following year, the Aga Khan presided over the meeting in Delhi, and in 1903 the Conference was held in Bombay under Badruddin Tyabji. Badruddin Tyabji, speaking as president of the 1903 Muhammadan Educational Conference, described the plans for a university as premature. Muslims should first lay a strong foundation of local Muslim schools and colleges which, initially at least, could be affiliated to the existing government universities.49 Akbar Hydari, Tyabji's nephew, spoke out against the whole idea of a Muslim university.50 Hydari argued that for secular advancement Muslims would be better off at the existing universities. Serious theological training was adequately provided in existing madrasas. Moreover, it would be foolhardy to bring the doctrines of different Muslim sects into open rivalry at one centre. At a regional meeting of the Educational Conference in Ahmadabad in October 1904, Muhammad Ali, younger brother of Shaukat Ali, replied to Hydari in an eloquent restatement of the Beck-Morison concept of a Muslim university.52 He called upon his experience at Aligarh and Oxford to argue for 'the expansion of Aligarh'. Muhammad Ali projected a bold view of India as a 'federation of religions'; only if Muslims and Hindus were allowed to cultivate their distinctive cultural traditions could they live together amicably. Therefore both the Muslim university at Aligarh and the Hindu university at Benares, proposed earlier in the year by Pandit Madan Mohan Malaviya, should be encouraged.

Professing 'no concern with politics, and certainly no desire to confound it with education', Muhammad Ali none the less warned that government educational policy must respond to the wishes of the people. The idea of a Muslim university had been generated by a popular movement: 'Aligarh is the people's very own.' Wider participation, however, also meant a greater variety of ideas about the university; if Aligarh was to ask for money from such far-off places, it had to offer something in return. To scores of meetings Mohsin ul-Mulk and others held out the image of Aligarh as the best hope of the Indian Muslims, the restorer of past greatness. The university was becoming a symbol of a reviving Islam. [6].

The other sessions were held at, Rampur (1900, Maulvi Syed Husain Bilgirami), Lucknow (1904- Prof. T. Morrison) and Aligarh (1905- Khalifa Mohd. Hussain). The major highlights of these different sessions were promotion of Science, law and other modern education at M.A.O. College and promotion of Women's education and establishment of Girls School at Aligarh and establishment of Fund for M.A.O. College. MAO College affairs as well as AIMEC were demanding more time and resource and it became tough for Secretary of MAO College management Nawab Mohsinul Mulk to do a balance of commitment for MAO College and AIMEC, than a staunch supporter of Aligarh Movement Sahebzadah Aftab Ahmad Khan was appointed as founding Jt. Secretary of AIMEC in the annual session of 1905 at Aligarh.

Dhaka Session of 1906 and Birth of Muslim league:

Even though the official publication of All India Muslim Education Conference "Muslim Educational Conference kay 100 Saal " does not talk about the this session due to one or the other reasons but it is almost very clear that the 1906, Dhaka session of All India Muslim Educational Conference was the birth place for "All India Muslim League". In the early October 1906 All India Muslim Educational Conference leaders and few others met Viceroy of India at Shimla and discussed some of their concerns. Nawab Khwaja Salimullah of Dhaka could not join the deputation due to his cataract operation [2]. The omission of Division of Bengal issue from the discussion or unsatisfactory response from the Viceroy made young Nawab Khwaja Salimullah unhappy and he proposed an All India Muslim Educational Conference to be held in Dhaka, capital of the then East Bengal and Assam Province in the year 1906. The conference was inaugurated on 27

December 1906 and continued till 29 December 1906 as Conference on Education. The inaugural session was chaired by Nawab Justice Sharfuddin, the newly appointed justice of Calcutta High Court. On 30 December 1906 political session of the conference took place. It was chaired by Nawab Viqar-ul-Mulk. In this session a motion to form an All India Muslim League (AIML) was proceeded. Initially a party styled as All India Muslim Confederacy was discussed. But, in the process the name All India Muslim League, proposed by Nawab Khawaja Sir Salimullah Khan Bahadur and seconded by Hakim Ajmal Khan, was resolved in the meeting. All delegates were registered as members of the proposed party led by Janab Muhsin-ul-mulk and Janab Viqarul Mulk, who were Joint Conveners. AIML was first Muslim political party in the history of India. A total of 1955 delegates attended the event. The conference was attended by most of the Muslim zamindars, educationists, pleaders, and other leaders of the community.

1907-1917: Sahabzadah Aftab Ahmad Khan Period:

AIMEC and Muslim University Movement

Sahebzadah Aftab Ahmad Khan was officially Joint Secretary of All India Muslim Educational Conference and Secretary of M.A.O. College management Committee, Nawab Mohsinul Mulk, Nawab Viqarul Mulk and Nawab Ishaq Khan remained Secretary of AIMEC during this time of 1905-1917 but their pre-occupation with MAO College affairs gave young and energetic Aftab Ahmad Khan almost absolute freedom to give AIMEC a new direction. This 12 year reign of Sahebzadah Aftab Ahmad Khan gave AIMEC a new direction and took it to a new peak and AIMEC became a reckoning force of Muslims of India. It also took interest in local issues of the place where annual session is held and attentions were paid to help and support local community to over come their social and educational problems. He also expanded the perimeter of AIMEC and its annual session was held even in Rangoon in 1909. During this time the annual sessions were held at Karachi (1907- Altaf Hussain Hali), Amritsar (1908- Sir Khawaja Salimuddin of Dhaka), Rangoon (1909- Sir. H.H. Nawab Mohd. Ali, raja of Mahmudabad), Nagpur (1910- Abdullah Yusuf Ali, Principal of Islamia College of Lahore and famous English translator of Quran), Delhi (1911 – Emadul Mulk Syed Hussain Bilgirami), Lucknow (1912- Major Syed Hasan Bilgirami), Agra (1913- Justice Shah Deen), Rawalpindi (1914, Maulvi

Rahim Bakhsh), Pune (1915, Justice Abdul Rahim), Aligarh (1916- Miyan Mohd. Shafi), Calcutta (1917, Nawab Sir Haider Nawaz Jang Bahadur Mohd Akbar Ali).

The plan for the Muslim University had by 1910 taken on the complexion and force of a national movement. The session of the All India Muslim Educational Conference at Nagpur in December, 1910 was presided by Abdullah Ibn Yusuf Ali Khan. In his address Sir Aga Khan gave the signal for a concreted, nation-wide effort to raise the necessary funds for the projected University. In moving the resolution on the University, the Aga Khan III made a stirring speech. He said, "This is a unique occasion as His Majesty the King-Emperor is coming out to India. This is a great opportunity for us and such as is never to arise again during the lifetime of the present generation, and the Muslims should on no account miss it. We must make up and make serious, earnest and sincere efforts to carry into effect the one great essential movement which above all has a large claim on our energy and resources. If we show that we are able to help ourselves and that we are earnest in our endeavors and ready to make personal sacrifices, I have no doubt whatever that our sympathetic government, which only requires proper guarantees of our earnestness, will come forward to grant us the charter. 'Now or never' seems to be the inevitable situation." To make a concerted drive for the collection of funds, a Central Foundation Committee with the Sir Aga Khan III as Chairman with Maulana Shaukat Ali (1873- 1938) as his Secretary; and prominent Muslims from all walks of life as members was formed at Aligarh on January 10, 1911. The Aga Khan III accompanied by Maulana Shaukat Ali, who was still in government service and had taken a year's furlough, toured throughout the country to raise funds, visiting Calcutta, Allahabad, Lucknow, Kanpur, Lahore, Bombay and other places. Willi Frischauer in his book, The Aga Khans writes, "His campaign for the Aligarh University required a final big heave and, as Chairman of the fund raising committee, he went on a collecting tour through India's main Muslim areas: 'As a mendicant', he announced, 'I am now going out to beg from house to house and from street to street for the children of Indian Muslims.' It was a triumphal tour. Wherever he went, people unharnessed the horses of his carriage and pulled it themselves for miles"[4]. The response to the touching appeal of the Sir Aga Khan III was spontaneous. On his arrival at Lahore, the daily "Peace" of Punjab editorially commented and called upon the Muslims "to wake up, as the greatest personality and benefactor of Islam was in their city." The paper recalled a remark of Sir Syed Ahmad Khan prophesying the rise of a hand from the unseen world to accomplish his

mission. "That personality" the paper said, "was of the Sir Aga Khan III." On that day, the "London Times" commenting upon the visit, regarded him as a great recognized leader of Muslims. Allama Shibli Nomani was with Sir Aga Khan in the delegation for fund raiser to Lahore. Shibli recited a very passionate Persian poetry to motivate the audience for fund raiser. The significant aspect of the Aga Khan's fund collection drive was not the enthusiastic welcome accorded to him, but the house to house collection drive. Qayyum A. Malick writes in his book "Prince Aga Khan" that once the Aga Khan on his way to Bombay to collect funds for the university, the Aga Khan stopped his car at the office of a person, who was known to be his bitterest critic. The man stood up bewildered and asked, "Whom do you want Sir?" "I have come for your contribution to the Muslim university fund," said the Aga Khan. The man drew up a cheque for Rs. 5000/-. After pocketing the cheque, the Aga Khan took off his hat and said, "Now as a beggar, I beg from you something for the children of Islam. Put something in the bowl of this mendicant." The man wrote another cheque for Rs. 15000/- with moist eyes, and said, "Your Highness, now it is my turn to beg. I beg of you in the name of the most merciful God to forgive me for anything that I may have said against you. I never knew you were so great." The Aga Khan said, "Don't worry! It is my nature to forgive and forget in the cause of Islam and the Muslims." The drive received further great fillip from the announcement of a big donation of one lac rupees by Her Highness Nawab Sultan Jahan Begum of Bhopal. The Aga Khan III was so moved by her munificence that in thanking her, he spoke the following words:

Dil'e banda ra zinda kardi,
dil'e Islam ra zinda kardi,
dil'e qaum ra zinda kardi,
Khuda'i ta'ala ba tufail'e Rasul ajarash be dahad"

It means, "You put life in the heart of this servant; you put life in the heart of Islam; you put life in the heart of the nation. May God reward you for the sake of the Prophet!". In sum, Sir Aga Khan collected twenty-six lacs of rupees by July, 1912 in the drive and his personal contribution amounted to one lac rupees.

The Major resolutions and achievement of this period were;

1. AIMEC received a generous donation from ruler of Bhopal, Begum Sultan Jahan and built its head office building at Aligarh. The building is known as "Sultan Jahan Manzil" and even today it holds the office of AIMEC.
2. Movement for Muslim University was primary attention of AIMEC. A National Campaign was in full swing to raise money for Muslim University.
3. Foundation Committee was established under the Chairmanship of Sir Agha Khan.
4. Special attentions were paid to local social and educational issues.
5. Proposal for 1% educational tax to landlords from their agricultural produces.
6. Maharaja Kashmir was requested to pay attention to the educational issues of Kashmiri Muslims. A delegation was sent to Maharaja Kashmir to pursue him to pay attention to the educational issues of Muslims of Kashmir. Arabic Teachers were appointed in Schools of Kashmir
7. Schools at Aligarh will have a Kinder Garden (KG) educational system
8. Urdu should be a medium of Instruction in educational systems in Urdu speaking areas like Punjab.
9. Committee was formed to revise schools curriculum in Bengal
10. State Governments needs to grant some financial assistance to M.A.O. College and Schools.
11. A special fund was established to support the cost of Conferences for teachers and professors.
12. A sub-Committee was formed to help Burma's (Myanmar) educational development.
13. Special scholarship was instituted for meritorious students of Medical and Engineering Colleges.
14. Recommendations were made to have at least one Muslim Members in every state and University Text Book Committee.
15. Efforts were made to start a 'Yateem-Khana" in Burma
16. The need of a Islamia College in every state and secondary school for Muslims in every district was realized and efforts were made to have a Islamia College in every state and a Secondary school for muslims in every district.
17. Efforts were made to bring Islamic Scholars (Ulema) into AIMEC's fold and efforts were made to clear existing confusions from the minds of Ulema.
18. Muslim University Fund Committee was established to raise funds for Muslim University.
19. Muslim students were Encouraged to receive Medical education.
20. A state Educational Conference in Punjab was established.
21. Scholarships were instituted for technical educations for Muslim

students.
22. A Movement was started to promote Madarsah of Calcutta to a Islamia College.
23. Protests were made when University of Calcutta dropped Arabic and Persian from their curriculum.

1917-1947: Nawab Sadar Yar Jang Period:

AIMEC under the umbrella of Aligarh Muslim University

In 1917, Sahabzadah Aftab Ahamd Khan was nominated into the British Council in the Ministry of Indian Affairs and he moved to England. AIMEC elected Maulana Habibur Rahman Khan Sherwani, Nawaba Sadar Yar Jang as its Joint Secretary. In 1920, when M.A.O. College became Aligarh Muslim University, at Amrawati, AIMEC made a constitutional amendment and AMU Vice-Chancellor became President of AIMEC and elected Maulana Habibur Rahman Khan Sherwani, Nawaba Sadar Yar Jang as Honorary Secretary and so he served to position till 1947. In his leadership, the first session was held in 1918 at Surat (Bombay State- now in Gujarat). The session was presided over by Sir Ibrahim Rahmatullah. The session appreciated the efforts of Bombay State Government for starting Urdu Medium Schools. A committee was formed under the leadership of Dr. Ziauddin Ahmad to promote a similar concept of Urdu Medium schools in other states. Fund was raised to establish a Muslim hostel in Surat. Proposal was adopted to start a Training College for the teachers of Arabic Schools/Madaris. The annual session of 1923 at Aligarh adopted the proposal to rename All India Mohammad Educational Conference to All India Muslim Educational Conference.

After the establishment of Aligarh Muslim University, the All India Muslim Educational Conference could not work with the same pace as it worked for the establishment of Aligarh Muslim University. At the same time division of Aligarh Movement leaders and establishment of a news University Jamia Millia Islamia took some of the resources of AIMEC. Even though the sessions of AIMEC used to held annually at Khairpur-Sindh (1919- Maulvi Rahim Bakhsh), Amrawati (1920 – H. Ibrahim Haroon Jaffer), Aligarh (1922- Miyan Fazal Hussain), Aligarh (1923- Sahabzadah Aftab Ahmad Khan), Bombay (1924-Ibrahim Rahmatullah), Aligarh (1925 – Sahabzadah Abdul Qayum), Delhi (1926- Abdul Rahim), Madras (1927 – Shaikh Abdul

Qadir), Ajmer (1928- Sir Shah Sulaiman), Banaras (1930 – Sir Ross Masood), Rohtak (1931 – Sir Syed Raza Ali), Lahore (1932 – Col. Maqbool Hussain Quraishi), Meerut (1934 – Sir Shaikh Abdul Qadir), Agra (1936- Sir Ziauddin Ahmad), Rampur (1936 – H.H. Sir Agha Khan) and the 50th anniversary session of AIMEC was held at Aligarh in 1937. In 1938, the annual session was held in Patna and Maulvi Fazal Haq presided over the session. The next sessions were held at Calcutta (1939–Nawab Kamal Yar Jang), Pune (1940, Maulvi Fazal Haq), Aligarh (1943 – Nawab Zaheer Yar Jang), Jabalpur (1944 – Sir Azizul Haq). The last session of All India Muslim Educational Conference in British India was held at Agra1945 and was presided over by Nawabzadah Liyaqat Ali Khan. These session were focusing on growth of Muslim University and other social and educational issues faced by Muslims of India. During the peak of freedom of India movement, AIMEC sessions were not very regular as the major energy of masses was used in freedom movement.

1947-till date: Post Independence period

On 14th &15th August 1947, British India became 2 independent countries India and Pakistan and due to Aligarh's geographical location, of course All India Muslim Educational Conference became an organization of India. An All Pakistan Educational Conference was formed in Pakistan by Mr. Syed Altaf Ali barelvi. The detail of All Pakistan Muslim Educational Conference can be found in "History of the Conference" by Mr. Syed Altaf Ali Barelvi. The subsequent few years were very tough for the Indian sub-continent and hence even at Aligarh, it took time to bring things in order. Dr. Zakir Hussain was appointed as first Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University in independent India. The Ministry of Educational affairs started looking into affairs of Aligarh Muslim University.

Secretary : 1949 - 1992

In the mean time in 1949, AIMEC elected Alhaj Obaidur Rahman Khan Sherwani as its Honorary Secretary. Alhaj Obaidur Rahman Khan was son of Maulana Habibur Rahman Khan Shrwani. This started a new chapter in the history of AIMEC. After his election as Honorary Secretary, the first session was held in 1952 at Aligarh. The session was chaired by AIMEC President and Vice-Chancellor of AMU Aligarh. After the Aligarh session, the last regular session of AIMEC was held in 1955 in Madras (Chennai) under the

leadership of Dr. Zakir Hussain. After 1955 session, no session of AIMEC held. After a gap of 38 years, a session of AIMEC was held in 1993 in Delhi under the Chairmanship of Prof. Rasheeduz Zafar, the then Vice-Chancellor of Jamia Hamdard. This is the last known AIMEC function.

As per Dr. Mohsin Raza, former president of AMU Students Union and a faculty at Jawaharlal Nehru Medical College at AMU Aligarh, a session of AIMEC was also held in 1969 at Aligarh. This session was presided over by Mr. Badruddin Tayyabji, the then Vice-Chancellor of AMU and president of AIMEC. Here is the narration of Dr. Mohsin Raza on 1969 session of AIMEC;

"One session that I attended was held in 1969, Late Badruddin Tayyabji attended this session. Several members assailed the inactivity of the AIMEC ,Maulana Saeedurrehman Zaini was extra loud on which Mr. Badruddin Tayyabji took an exception and got angry". In the same meeting the Sultan Jahan Manzil Hall was officially allotted without rent to the Muslim Social Uplift Society's Medical Coaching Centre."

The official publications of AIMEC do not have any account of this session of 1969.

Till 1972, Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University used to be President of AIMEC. In 1972, AIMEC made an amendment in its constitution and elected Industrialist Mr. Mustafa Rasheed Sherwani, Founder & Chairman of Jeep Flashlight. This marked a new start in AIMEC and now AMU doe not have any association with AIMEC. In the meantime Kr. Ammar Ahmad Khan was elected as Honorary Secretary in 1958 and served till 1964, and then Prof. Anwarul Haq Haqqi was Honorary Secretary from 1964 to 1970. Once again Alhaj Obaidur Rahman Khan Sherwani got elected as Honorary Secretary and he served till his last breath in 1992 and then his son Prof. Reyazur Rahman Khan Sherwani got elected as Secretary of AIMEC and Mr. Amanullah Khan Sherwani as Joint Secretary and they are serving till date. AIMEC elected Kr. Ammar Ahmad as its President in 1992 and had served till his last breath in 2004. After his sad demise, no news about any President of AIMEC. As a principal organ of Aligarh Movement, AIMEC found 5 permanent births in AMU Court. Here is the list of MEC representative in AMU Court in the last session; Mr. Asad Yar Khan, New Delhi, Mr. Kh. Mohd. Shahid, New Delhi, Mr.

Munawwar Haziq, New Delhi, Dr. Shahid Qamar Qazi, Aligarh and Prof. Akhtarul Wasey, New Delhi.

All India Muslim Education Conference had played a key role in the establishment of Aligarh Muslim University and had always supported AMU for its progress. Even after 1920, when Aligarh Muslim University was created, AIMEC generated funds to start different courses at AMU and helped in promoting the cause of Aligarh Movement. But for one or the other reasons, AIMEC stopped playing its role in independent India. The geo political situation of Independent India is totally different than British India but this does not prevent to work for the upliftment of social and educational problems of Muslims of India. Different Muslim Social and Educational organizations got started in independent India and flourished in their respective mission like Anjuman Islam and Anjuman Khairul Islam in Maharashtra, Al-Amin in Karnataka and many more in different parts of the country and they had established schools and colleges in their respective area of operation whereas AIMEC became extinct.

To know more about Muslim Education Conference, please refer to;

1. Muslim Educational Conference kay 100 Saal By Amanullah Khan Shrwani
2. Education of Indian Muslims: a study of the All-India Muslim Educational By Akhtarul Wasey, All-India Muslim Educational Conference
3. "Separatism among Indian Muslims" by Francis Robinson, "
4. The All India Muslim educational conference: its contributions By Abdul Rashid Khan
5. The Muslims of British India By Peter Hardy
6. Campaign for Muslim University- David Leylyveld & Gail Minault

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اثرات

سید احمد خان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو ماضی کے بند خول سے باہر نکالنے اور جدید تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی بھرپور جدوجہد کی نتیجتاً وہ معاشی ترقی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔ کانفرنس نے ابتدائی بیس (۲۰) سالوں (یعنی اپنے قیام سے ۱۹۰۶ء تک) میں نہ صرف اپنی بنیادیں مضبوط کیں، بل کہ برِ عظیم میں مسلمانوں کی تمدنی زندگی کے مختلف تعلیمی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی شعبوں میں دُوررس اثرات مرتب کیے اور اس طرح ہماری ملّی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

تعلیمی اثرات:

یہ کانفرنس سید احمد خان کے تصورِ تعلیم کا نتیجہ تھی۔ آپ کی بے لوث اور مثالی کاوشوں کے ثمرات یوں مرتب ہوئے:

- کانفرنس نے مسلمانوں کو چار دانگ ہند میں تعلیم کی طرف راغب کیا۔
- قوم کے ہونہار بچوں کے لیے وظائف کا انتظام کیا، قومی تعلیم گاہیں قائم کیں، تعلیمی مصارف کی بہم رسانی کی سبیلیں نکالیں۔
- مسلمانوں کو تعلیمِ نسواں، مدارسِ شبینہ، صنعت و حرفت، اسلامی علوم و فنون، تجارت و زراعت اور دیگر پیشوں کی تعلیم و تربیت جسمانی کی جانب توجہ دلائی۔
- حکومت کو مسلمانوں کے ہر قسم کے جائز تعلیمی حقوق و ضروریات کی جانب متوجہ کیا یہاں تک کہ بعض دیسی ریاستوں کے دروازوں پر بھی دستک دی۔
- کانفرنس کی تحریک سے اردو لٹریچر میں معقول اور قابلِ قدر اضافہ ہوا۔
- مسلمانوں کی علم و فن میں دل چسپی بڑھنے سے ان میں حکمت اور دانائی کی اقدار کو راسخ کر دیا۔
- کانفرنس کے خطبات، تقاریر اور قراردادیں آج بھی مسلمانوں کی ترقی کے لیے منارِ نور ہیں۔

معاشی اثرات:

۱۸۵۷ء کے سانحہ نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور انگریزی ملازمت سے متنفر کر دیا تھا، لیکن اب صورت حال بدلی:

- سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ نے جب مسلمانوں کے قلوب و افکار، علم و فن کی روشن خیالی اور وسعت کو اجاگر کیا، تو ان کے لیے ملازمتوں کے حصول کے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں۔
- یہاں کے فارغ التحصیل نوجوانوں نے سرکاری و نیم سرکاری ملازمتوں میں شمولیت اختیار کر کے حتی المقدور مسلمانوں کی ترقی کے سامان پیدا کیے۔ قوم کے یہ سپوت سرسید احمد کے خوابوں کی تعبیر ثابت ہوئے۔
- مسلمانوں نے کانفرنس کی جدوجہد سے صنعت و حرفت، زراعت، تجارت، وکالت وغیرہ میں کافی ترقی کی۔
- مسلمانوں کی معاشی بدحالی ختم ہونے سے وہ اس قابل ہوئے کہ برعظیم کی دوسری اقوام خاص کر ہندوؤں کے مدِ مقابل نیا مقام پیدا کر لیا۔

معاشرتی اثرات:

حصولِ تعلیم کے شوق اور مسلمانوں کی معاشی حالت کی بہتری نے اُن کی معاشرتی زندگی میں بھی انقلاب برپا کر دیا:

- منزل اور حصولِ منزل کی جدوجہد سے اتحاد و یگانگت کا درس ملا۔
- مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت کو قومی تعصّبات کی بیڑی اور ملکی رسم و رواج (جو ان میں ہمسایہ قوم سے تمدنی میل جول کے باعث در آئے تھے) کی غلامی سے بالکل آزاد کر دیا۔
- سرسید احمد خاں کے مشن کو کانفرنس نے ان کی رحلت کے بعد نہ صرف آگے بڑھایا، بل کہ

---

[۱] ''سرسید احمد خاں کے جانشینوں میں بھی چند ایسے لوگ تھے جن کے دل و دماغ ملکی اور ملی جذبے سے سرشار تھے۔ وہ اپنے مقصد کے پیشِ نظر کام کی لگن کا جذبہ بدرجۂ اتم رکھتے تھے۔ پھر نہ وہ رات کو رات سمجھتے تھے اور نہ دن کو دن۔ انھیں لوگوں میں نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ قابلِ ذکر ہیں''۔ (عثمانی، امیر احمد، پروفیسر حکیم۔ مشمولہ، مضمون: ''میڈیکل کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور ڈاکٹر ہادی حسن''۔ کراچی، العلم سہ ماہی جنوری تا مارچ و اپریل تا جون ۱۹۸۸ء، جلد نمبر ۳۶ شمارہ نمبر ۱ و ۲، ص ۸۱)۔

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں انقلاب آفریں کردار ادا کیا۔

سیاسی اثرات:

مسلمانوں میں شعور اجاگر ہونے پر انھوں نے ملت کی بقا و ترقی کے لیے تدابیر بھی سوچیں:

- معاشرے میں بیداری کے باعث مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی بحالی اور حصول کے لیے کوششیں عمل میں آئیں۔
- کانفرنس نے مسلمانوں میں قومی و اجتماعی تعلیم و ترقی کے احساس کو مہمیز لگائی جس سے آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریکِ آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔
- آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی توجہ اور کوشش سے مسلم لیگ معرضِ وجود میں آئی، جس کے جھنڈے تلے برِعظیم کے مسلمان جمع ہوئے اور یوں آزادی کا قافلہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہوا۔
- اسی تنظیم نے سرسید احمد کے دو قومی نظریے کو اپنے منشور کی بنیاد بنا کر نہ صرف مسلم قومیت کو اجاگر کیا، بل کہ مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑی اور تمام تر دشواریوں کے باوجود مسلمانوں نے متحد ہو کر قائداعظم کی قیادت اور بے مثال رہنمائی میں ۱۹۴۷ء میں مملکتِ پاکستان حاصل کی۔
- تحریک علی گڑھ[1] سے قیام مسلم لیگ تک کی تاریخ، مسلم تحریکِ آزادی کا ایک اہم باب ہے، جس پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدارتی خطبات (۱۸۸۶ء-۱۹۰۶ء) شاہد عادل ہیں۔

---

[1] ''یوں تو تحریکِ پاکستان تقریباً ایک صدی سے چل رہی تھی۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا قیام ایک چھوٹے سے پاکستان کا سنگ بنیاد تھا۔'' (زاہدی، سید مسعود۔ مضمون ''قائداعظم! ہم شرمندہ ہیں!''، ہفت روزہ استقلال، لاہور، ۱۲ تا ۱۸ رجنوری ۱۹۸۳ء، ص ۱۹)۔ نیز بقول یاسمین خان، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی جو دہلی سے چند گھنٹوں کی مسافت پر واقع ہے، اسے قیام پاکستان کی نظریاتی جنگ کے مرکزی حیثیت بھی حاصل تھی۔ (عظیم بٹوارا۔ پاکستان اور ہندوستان کا قیام)

○ بیسویں صدی کے آغاز میں کانفرنس کی اگلی صف میں شریک مسلم زعما مسلم سیاست میں بھی پیش پیش تھے۔ بقول محترمہ ممتاز معین[1]، یہ کانفرنس مسلم لیگ کے قیام (۱۹۰۶ء) تک ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کی نگہداشت کرتی رہی۔

الغرض ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام اسی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا توسیعی عمل تھا۔

ظہور الدین خاں امرتسری

---

[1] مسز ممتاز معین ایم اے، سابقہ پرنسپل اسلامیہ کالج۔ کراچی، مصنفہ دی علی گڑھ مومنٹ۔

پروفیسر سلیمان اشرف اکابرین ملت کی نظر میں

مولانا سلیمان اشرف صاحب کی تقریر، جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے نشر ہوئی۔ بعد میں 'الخطاب' کے عنوان سے ۱۹۱۵ء میں انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔

مولانا سید سلیمان اشرف کو اللہ تعالیٰ نے جہاں گونا گوں کمالات اور خوبیوں سے نوازا تھا وہاں ان کو تقریر و خطابت کا بھی بڑا ملکہ عطا کیا تھا، ان کی ہر تقریر کی طرح یہ تقریر بھی نہایت موثر، ولولہ انگیز اور از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق تھی۔ دیکھیے مولانا کا یہ خطاب جہاں بہت سی مفید معلومات لیے ہوئے ہے وہیں اسلامی علوم و فنون کی اجمالی تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے۔ نیز ان کی تصانیف آج بھی ایک زندہ رہنما کی طرح ہیں۔

ماننا پڑتا ہے کہ مولانا سلیمان اشرف تقریر و تحریر میں 'علمہ البیان' کی نعمتِ عظمٰی سے سرفراز تھے۔ بقول آل احمد سرور، مولانا کی شخصیت میں علم کی رئیسانہ شان ہے۔ ان کی عظمتوں کے علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، خواجہ حسن نظامی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی[1] اور نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے اہلِ علم معترف رہے ہیں۔ ممتاز ادیب اور تذکرہ نگار طالب ہاشمی (۱۹۲۹ء۔ ۱۸ر فروری ۲۰۰۸ء) رقمطراز ہیں۔

> "حضرت مولانا سید محمد سلیمان اشرف کا شمار اپنے دور کے سرآمدِ روزگار علما میں ہوتا تھا۔ وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اسلامیات کے صدر تھے اور قریب قریب ساری عمر انھوں نے علی گڑھ ہی میں گزار دی۔ ان کا وجود علی گڑھ یونی ورسٹی کے

---

[1] ڈاکٹر صاحب مولانا سلیمان اشرف کے درسِ قرآن میں شامل ہو کر اُن سے کسب فیض کرتے۔ آپ کی مولانا سے عقیدت و محبت کس درجہ کی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی کوٹھی 'ذکا منزل' کا سنگِ بنیاد پروفیسر سلیمان اشرف کے ہاتھوں رکھوایا۔ (زبیری، محمد امین۔ 'ضیائے حیات' ص ۲۶۴۔ طبع دین محمدی پریس کراچی۔ سنہ ندارد)

لیے آیۂ رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ علم و فضل کا بحرِ زخّار اور ظاہری و باطنی خوبیوں کا پیکرِ جمیل تھے۔ ہزاروں تشنگانِ علم ان کے فیضانِ علمی سے بہرہ یاب ہوئے اور پھر اپنے اپنے دوائر میں ان کے نام کو روشن کیا۔" [1]

علامہ شبیر احمد خاں غوری فرماتے ہیں۔ حضرت مولانا سلیمان اشرف کی ذاتِ گرامی مرجع اکابر و اعیان تھی، ان کی بارگاہ میں نہ صرف یونی ورسٹی کے اکابر بل کہ ضلع علی گڑھ کے روٴساءِ عالی مقام اور شہر کے عمال و اعیان (امراء و وزراء) حاضر ہوتے تھے۔ بہ قول ڈاکٹر طلحہ رضوی ان کا آبائی نسب حضور غوثِ اعظم رضی عنہ اور مادری نسب حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی رحمہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ فخریہ سے منسلک تھے۔

مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ مولانا سلیمان اشرف بلاشبہ بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے اور رموز خطابت سے بھی آشنا...... جبکہ بہ قول رشید احمد صدیقی، سید صاحب کو فنِ خطابت [2] میں کمال حاصل تھا:۔

"آواز میں کڑک اور لچک، دھمک تھی...... خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں اُلٹ دیں گے۔"

خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۲۳ء کی 'درویش جنتری' میں سید صاحب کی قادر الکلامی اور شگفتہ بیانی کا ذکر بڑے ہی دل نشیں اور دل کش انداز سے کیا ہے:۔

---

[1] ماہنامہ ضیائے حرم۔ لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۸۱

[2] 'عام خلقت کو متاثر کرنے کے لیے فصاحت و بلاغت سے زیادہ کارگر حربہ اور کوئی نہیں۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی تحریکیں ہمیشہ عامۃ الناس کے دلوں میں جگہ کر کے ابھرتی رہی ہیں، جب کسی قوم پر تباہی کی گھٹائیں منڈلا رہی ہوں تو اُس وقت صرف جذبات کی کڑکتی ہوئی بجلی میں ہی یہ طاقت ہوتی ہے کہ ان بادلوں کو چاک کر دے۔ یاد رہے کہ صرف وہی لوگ دوسروں کو جوش میں لا سکتے ہیں، جن کے اپنے دل سینے میں درد سے تڑپ رہے ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ بڑے بڑے لیڈروں کے الفاظ میں لوگوں کے دلوں کو موم کی طرح پگھلا کر جس طرف وہ چاہیں ادھر موڑ لینے کی تاثیر ہوتی ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جذبات کی بھٹی بھڑکا لینے کی استعداد رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے انقلابات صرف قوتِ تقریر سے برپا ہوتے ہیں۔' (ہٹلر، ایڈولف۔ 'تزکِ ہٹلری' (مترجم): چشتی، محمد ابراہیم علی۔ فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء۔ ص ۱۶۵)

''تقریر ایسی تیز اور مسلسل کرتے ہیں جیسے ای-آئی-آر کی ڈاک گاڑی۔ دورانِ تقریر صرف درود پڑھنے کے لیے تھوڑی دیر میں وقفہ ہوتا ہے، ورنہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمالہ کی چوٹی سے گنگا کی دھارا نکلی ہے، جو ہردوار تک کہیں رُکنے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لے گی۔ بیان کی ایسی روانی آج کل ہندوستان کے کسی عالم میں نہیں ہے۔ تقریر میں محض الفاظ ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر فقرے میں دلیل اور علمیّت کا انداز ہوتا ہے۔''

جناب سید امیر الدین قدوائی مرحوم تحریر کرتے ہیں:

''حضرت مولانا پروفیسر سیّد سلیمان اشرف صاحب قبلہ بڑے جید عالم اور مُرتاض درویش تھے۔ وہ اپنی طرف سے تفسیر کا درس مُسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی مسجد میں دیا کرتے تھے۔ اور جو لوگ اس میں شرکت کرتے تھے صرف اُن ہی کو شاگرد تسلیم کرتے تھے، وہ فیض کا دریا تھے۔ جس نے حسبِ ظرف جو کچھ اُن سے حاصل کرلیا اُس کی برکت اُسی نے نہیں بلکہ دُنیا نے بھی دیکھی اور اُس سے نفع پایا۔'' [1]

ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی (۱۹۱۶ء۔۱۹۹۵ء) سابق سربراہ شعبۂ اُردو، جامعہ کراچی ''رفت و بود'' کے زیرِ عنوان رقم طراز ہیں:

''مَیں نے بہت سی یونی ورسٹیاں دیکھی ہیں، بڑے بڑے علما کو دیکھا اور قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے، لیکن سلیمان اشرف جیسا عالم مَیں نے نہیں دیکھا۔ مَیں جب اقبال کے مردِ مومن کا تصور کرتا ہوں اور اپنے آس پاس اسے تلاش کرتا ہوں تو مولٰنا سلیمان اشرف کا پاکیزہ اور روشن چہرہ میرے سامنے آجاتا ہے۔'' [2]

---

[1] ماہنامہ ''تاج'' کراچی محمود نمبر، جلد ۱۲، شمارہ ۸، ص ۱۱۲

[2] روزنامہ جسارت کراچی، ۲۰ رجون ۱۹۸۰ء، ص ۶

جامع مسجد یونی ورسٹی
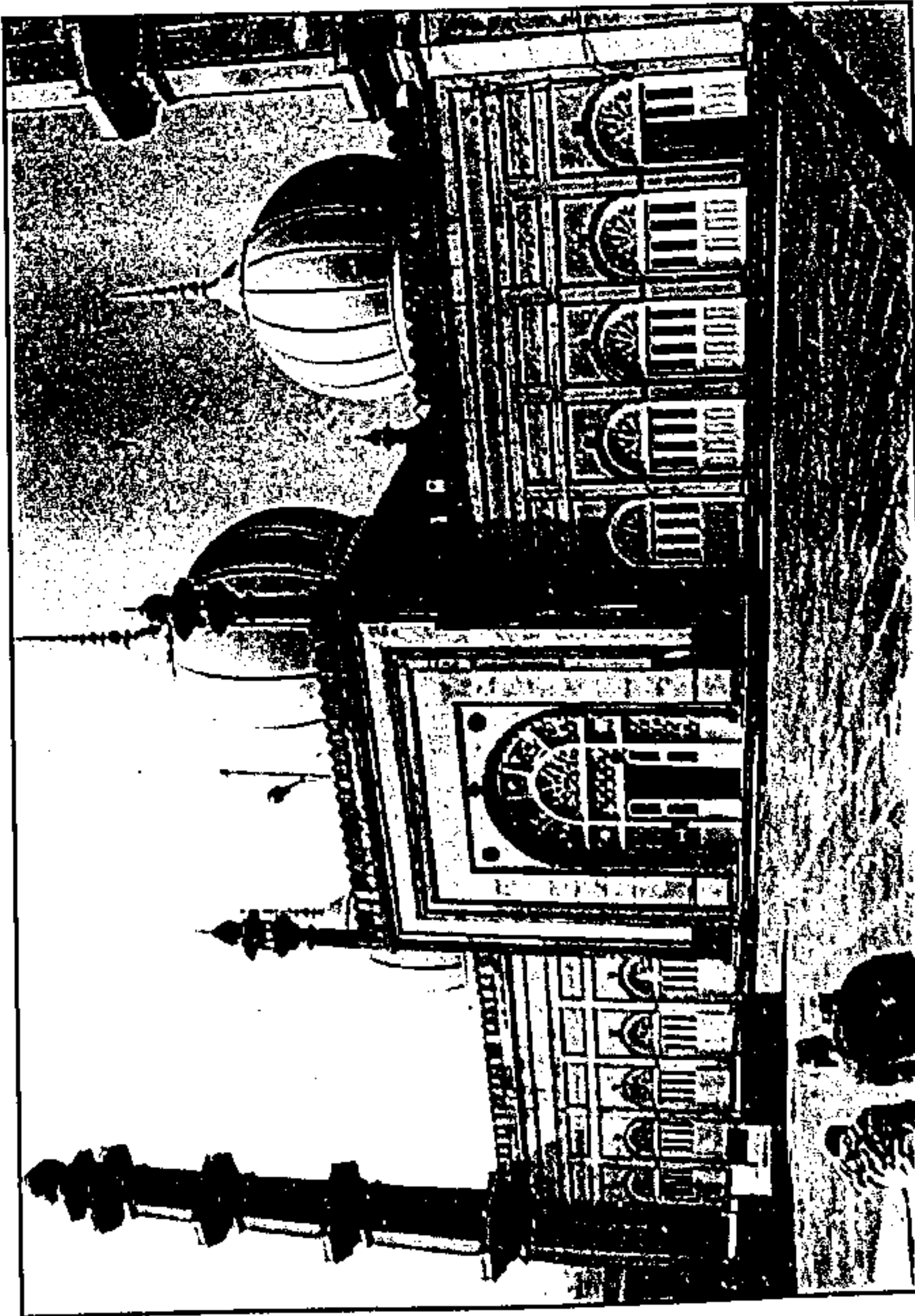
مولانا سلیمان اشرف ایک بالغ نظر مصلح

مولانا سلیمان اشرف ایک بالغ نظر مصلح بھی تھے، اس لیے انھوں نے اپنے لیکچرز اور تحریروں کے ذریعہ مسلم معاشرہ میں درآنے والے بگاڑ اور مختلف خرابیوں کی نشاندہی کر کے اصلاحِ احوال کی پوری کوشش کی۔ آیئے اُن کی کچھ تصانیف سے ایسی مساعی کی چند مثالیں دیکھتے ہیں۔

غیر محرم مرد کے ہمراہ حج وعمرہ:

''آج کل یہ مسئلہ بنالیا گیا ہے کہ اگر عورت کسی ایسی عورت کے ساتھ حج کے لیے جائے جس کے ساتھ اُس کا محرم ہو تو سفر جائز ہوگا۔ ہرگز یہ مسئلہ احناف کے نزدیک مقبول نہیں۔ ایسے مفتی جنھیں اپنے مذہب کے لطائف ونفائس کی خبر نہیں، اُن کے فتاوے سے احتراز چاہیے۔ عورت کے ساتھ جب تک شوہر یا محرم قابلِ اطمینان نہ ہو سفر حرام ہے۔ اگر کرے گی حج ہو جائے گا، مگر ہر قدم پر گناہ لکھا جائے گا۔ محرم وہی ہے جس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ ہمارے ائمہ احناف کی یہی تحقیق ہے اور یہی مسئلہ حق ہے۔'' [1]

آغاز سفر کے لیے بعض دنوں کا نحس خیال کرنا:

''یہ خیال محض عامیانہ ہے کہ بدھ کا دن منحوس ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ حضرت محبوبِ الٰہی سیدنا نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کی اس دن کے ساتھ عجیب خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی ولادت چہار شنبہ کو ہوئی، آپ کی بیعت کا دن چہار شنبہ ہے، شیخ نے جس روز خرقۂ خلافت عطا فرمایا وہ چہار شنبہ کا دن تھا، آپ نے جس روز رحلت [2] فرمائی وہ چہار شنبہ تھا۔'' [3]

---

1. محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا: الحج، طبع مسلم یونی ورسٹی پریس۔ علی گڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ۳
2. یہ کیسا اتفاق ہے کہ مولانا سلیمان اشرف کی وفات بھی چہار شنبہ کے روز ہوئی۔
3. الحج: ص ۳، ۴

کم خوابی و کم خوری:

اطبا متفق ہیں کہ کم کھانا اور کم سونا انسانی صحت کے لیے مفید ہے۔ بسیار خوری اور گھنٹوں لمبی تان کر سونا اگر صحت کے لیے مضر ہے تو نام نہاد ڈائٹنگ سے جسم کو اتنا کمزور کر لینا کہ بیماری کو دعوت دینے کا باعث بنے دونوں انتہا پسندی کا مظہر ہیں۔ اسلام اعتدال کا حکم دیتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''شریعتِ محمدی نے مسلمانوں کو کم کھانے اور کم سونے کی طرف بہت ہی رغبت دلائی ہے تا کہ قوائے حیوانیہ کا ایسا غلبہ نہ ہونے پائے جو قوائے ایمانیہ کو مغلوب کر لیں''۔ [1]

شرعی لباس کیا ہے؟:

یہ ایک بے نتیجہ اور خواہ مخواہ کی بحث ہے۔ لباس ستر کے لیے ہے اس کا صاف ستھرا اور پاکیزہ ہونا شرط اوّل ہے۔ مولانا اسلام کی مرضی و منشا بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اسلام نے لباس کے باب میں اس قدر ضرور اصلاح کی ہے کہ متکبرانہ و بے ستر و بے حیائی کا جامہ نہ ہو۔ اور یہ ایک کامل مذہب کا فرض تھا۔ باقی کسی خاص تشخص کو لباس میں کچھ بھی دخل نہیں دیا۔ ہاں شارع علیہ السلام کا لباس بے شک مسنون و موجبِ اجر۔ عبا، جبہ، تہمد و قمیص عربی مسنون و محبوب مگر فرض و واجب نہیں''۔ [2]

مولانا مرحوم کو کیا خبر تھی کہ دین کے علمبردار حضرات مخصوص ٹوپیوں اور عماموں کے ساتھ اپنے گروہ کو دوسروں سے الگ اور نمایاں کرنے کا عجیب و غریب وطیرہ اختیار کریں گے اور رنگ برنگے پہناوے کی بدولت ملت کو ٹکڑیوں میں بانٹنے کا (غیر ارادی طور پر ہی سہی) ناپسندیدہ کارنامہ انجام دیں گے۔

---

[1] محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا: الحج، طبع مسلم یونی ورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ۲۳

[2] سید سلیمان اشرف بہاری، پروفیسر مولانا: البلاغ، طبع مطبع احمدی، علی گڑھ، ۱۹۱۴ء، ص ۱۵

مسلمانوں کی سیاست دین سے جُدا نہیں:

کم فہمی اور لاعلمی کی بنا پر بعض حضرات اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط کرنے سے گریزاں ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ اسلام کو صرف عبادت تک ہی محدود رکھا جائے، یہ طرزِ عمل نہایت ہی خطرناک ہے کہ سیاسی اور معاشرتی معاملات میں لوگوں کی راہ نمائی کرنے کے بجائے انھیں حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر چہ "دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے دین ودنیا کا ہر پہلو انسانی حیات اور ضروریات کے لیے ایک مکمل ضابطہ پیش کیا، کوئی ایک بھی گوشۂ حیات ایسا نہیں جسے اسلام واضح سے واضح شکل میں پیش نہ کرتا ہو، جہاں وہ روحانی اخلاقی تعلیم دیتا ہے وہیں تمدنی، معاشرتی، تعلیمی، صنعتی، اقتصادی، تجارتی، سیاسی مسائل پر مکمل اصول پیش کرتا ہے، دین ودنیا کو ساتھ لے کر چلتا ہے، وہ دوسرے مذاہب کی طرح رہبانیت نہیں سکھاتا۔"[1] مولانا سلیمان اشرف نے اپنے رسالہ البلاغ کے حصہ اسلام وخلافت میں اسلام...... اُصولِ تمدُّن اور اسلام...... اسلام اور سیاست...... اسلام اور حرب...... خلافت...... جیسے عنوان قائم کر کے انسانی ضابطۂ حیات کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اسلام نے ایسی ضروریاتِ زندگی جو انسانی حیات کے لیے جزو لاینفک ہیں مثلاً تمدّن، سیاست، حرب۔ اس کو خوب حل فرمادیا۔ اور یہ ایک کامل وصادق مذہب کا فرض تھا۔

مولانا ان عناصر سے بھی مخاطب ہوتے ہیں جو اپنی دعوت وتبلیغ میں اسلام کے قانون، اس کے اجتماعی عدل، معاشی مساوات، معاشرتی اور سیاسی نظام کی بات نہیں کرتے، انھوں نے اپنے اجتماعات اور پروگراموں کو محض چند مذہبی مسائل اور وعظ ونصیحت تک محدود کیا ہوا ہے جبکہ قرآن اور کتبِ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں زندگی کے جملہ پہلوؤں پر جامع ہدایات ملتی ہیں، مگر عبادات اور انسان کے تعلق باللہ کی نسبت مجموعہ ہائے حدیث کا بہت بڑا حصہ اجتماعی اور معاشی مسائل، حقوقِ انسانی، مملکت کے انتظامی امور اور قیامِ امن وانصاف کے لیے دیوانی اور فوجداری قوانین

---

[1] فلسفۂ عباداتِ اسلامی از مولانا محمد عبد الحامد قادری بدایونی، ادارۂ پاکستان شناسی۔ لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۲

پر مشتمل ہے۔ مذکورہ رسالہ میں مولانا سلیمان اشرف فرماتے ہیں:

''احکامِ شرعیہ سے جو حضرات کہ ناواقف ہیں۔ اور اُنھیں توفیق اس سے آگاہی کی بھی نہیں ہوتی۔ وہ بربنائے جہل مرکب[1] یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام صرف تزکیۂ نفس سکھلاتا ہے باقی اُسے دُنیاوی اُمور میں کوئی دخل نہیں۔ اس تیرہ صدی میں جبکہ الحاد وجہل کی گھٹا مسلمانوں پر اُن کی بدنصیبی کی طرح چھائی ہوئی ہو اس طرح کی آوازیں اور بھی اسلام سے بے پروا کرنے والی ہیں۔ لہٰذا یہ بتلا دینا کہ اسلام ہی ہے جس نے تمدن و سیاست وحرب تمام دنیا کو سکھلایا۔ ایک نہایت ضروری بات ہے''۔

چناں چہ خالق کے عطا کردہ کامل نظام...... دین حنیف کو من چاہے خانوں میں بانٹنے کی جاری عمومی روش کو ڈاکٹر محمد ارشد (جامعہ پنجاب) نے اپنے مقالے 'اسلامی ریاست کی تشکیل جدید' میں بے بصیرتی، کوتاہ اندیشی اور خودغرضی سے تعبیر کیا ہے کہ کسی قوم کے اجزائے ترکیبی میں جہاں تہذیبی، ثقافتی، سماجی، مذہبی اور روحانی عوامل بے حد اہمیت کے حامل ہیں، لیکن سیاسی شعور سے عاری انسانوں کا کوئی گروہ دیگر تمام تر خصوصیات کے باوصف ایک قوم کہلانے کا مستحق ہرگز نہیں ہے۔ بقول غلام غوث صمدانی علیگ:

خواہی از سیاست دین جُدا	وای بر تدبیرِ طبع نارسا
ای ز دین بیگانہ و حق ناشناس	دینت الحاد و سیاست بے اساس

---

[1] جہلِ مرکب (ع) مذکر و مونث۔ دُہری نادانی، نادان ہونے پر اپنے آپ کو دانا جاننا، کسی چیز پر خلاف واقع اعتقاد کرنا۔ مثلاً سونے کو چاندی اور چاندی کو سونا جاننا۔ دو جہلوں میں گرفتار ہونا، یعنی عدم علم اور ناواقفیت عدم علم، غلط واقفیت (۲) جو علم نہ ہونے کے باوجود خود کو عالم سمجھے۔

~ آنکس کہ نداند و بداند کہ داند　　　در جہلِ مرکب ابدالدہر بماند

حکیم محمد خلیل احمد القادری الجائسی *

حیاتِ مولانا سلیمان اشرف کی چند جھلکیاں **

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

بلاشک حی و قیوم کے خاص بندے، موت کو اگلے مراتب کے لیے زینہ اور فتح باب بناتے ہیں، بوسیدگی، شکستگی اور بربادی ان کی موت کا دوسرا نام ہے جو حیی و ممیت سے کٹ گئے اور فنا کے گھاٹ اتر گئے۔

بقول ڈاکٹر طلحہ رضوی، آپ کا آبائی نسب حضور غوث اعظم رضی عنہ تک اور مادری نسب حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی رحمہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ آپ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ فخریہ سے منسلک تھے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کانپور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا احمد حسن رحمہ تعالیٰ کی خدمت میں پہنچ کر کسب علوم دین کی خواہش ظاہر فرمائی۔ استاذ وقت پہلے حدیث اور پھر منطق کی تعلیم دینا چاہتے تھے، لیکن سید صاحب پہلے منطق اور بعد میں حدیث کی تحصیل پر مُصر تھے۔ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے جون پور حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں رحمہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا رحمہ تعالیٰ نے سیّد زادہ کی ہر خواہش پر سرِ تسلیم خم کرنے کو خوش نصیبی سمجھتے ہوئے ہر بات بہ طیب خاطر قبول فرمائی اور اس طرح ایک جوہر شناس ماہر کو ایک گوہر بے بہا مل

---

* سابق ریڈر طبیہ کالج۔ علی گڑھ

** مضمون موصولہ ہمراہ گرامی نامہ بنام ظہور الدین خاں از بیت النور، سرسید نگر۔ علی گڑھ مورخہ ۱۱ راگست ۱۹۸۶ء

گیا۔ آپ نے لحہ بہ لحہ اپنی ذہانت وصلاحیت کے خیرہ کن جواہر ریزے بکھیرنا شروع کر دیے، اور آخر کار آپ کی جلالت، علم وفضل اور عشقِ رسول نے آپ کی شخصیت کو ایسا تراشا کہ خود جوہری اپنے گوہر کی آب وتاب سے خیرہ ہو کر اس کا عاشق ہو گیا۔ چناں چہ ایک بار جون پور میں ایک محفل میلاد مقدس میں سیّد صاحب علم وحکمت اور عشقِ رسول کی فضا کو معنبر ومعطر فرمانے میں محو تھے کہ ایک مرقعِ علم وحکمت نے منبر پر پہنچ کر وفورِ محبت سے سرشار اور وارفتہ سید صاحب کو سینہ سے چمٹا لیا اور پیشانی کو بوسہ دینے لگے۔ یہ تھے آپ کے استاذ حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں رضی عنہما۔ سیّد صاحب بھی اپنے استاد کے پروانہ تھے۔ آخری سانس تک استاد پر جان نچھاور کرتے رہے اور جب استاذ نے اپنے خالق کے حکم کو لبیک کہا، تو آپ نے ہوش وحواس کھو دیا۔ عرصہ تک کھوئے کھوئے سے رہے۔ آخر کار اسی مدرسہ میں تدریس اور استاد مرحوم کی نیابت کے فرائض کو قبول فرما لیا۔ ایک مناسب موقع پر سیّد صاحب کے عقیدت مند مولوی جواد علی صاحب نے آپ کے علم میں لائے بغیر علی گڑھ کالج کے شعبۂ دینیات کے استاد کی ایک جگہ کے لیے درخواست دے دی۔ پھر انھی کے اصرار پر ۱۹۰۸ء میں آپ بحیثیت استاذ شعبۂ دینیات علی گڑھ تشریف لائے۔

آپ کے حاسدین ومفترین نے آپ کے قیامِ علی گڑھ کے دوران جو جو گُل کھلائے اس کا تذکرہ کئی مستند مضامین میں آچکا ہے۔ یہاں بسلسلۂ تقرر ایک واقعہ پیش کر رہا ہوں، جو بورڈ اس جگہ کے استاذ کے انتخاب کے لیے مقرر کیا گیا تھا اس میں ایک اہم رکن نواب مزمل اللہ خان صاحب رئیسِ بھیکم پور بھی تھے۔ تقرر کے لیے غور وخوض اور فیصلہ کے وقت نواب صاحب موجود نہ تھے اور ان کی شخصیت کے پیش نظر ان کی رائے بہر حال قابلِ اعتنا اور ناگزیر تھی۔ نواب صاحب نے حضرت کے تقرر کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مولوی حسین احمد صاحب مدنی ان کی قابلیت کی تصدیق کر دیں، جو اتفاقاً علی گڑھ ہی میں موجود تھے۔ نواب صاحب نے شب میں دعوت اور دوسرے دن جلسۂ سیرت پاک کا پروگرام مرتب کیا۔ اب حضرت کی جلالتِ شان، صلابتِ ایمان، کمالِ جرأت واستغنا کی ایک جھلک قارئین ملاحظہ فرمائیں۔ شب کی دعوت میں حضرت مدعو تھے، وہاں پہنچ کر کھانے سے لے کر نشست وبرخاست تک فرقِ مراتب دیکھ کر آپ کی رگ
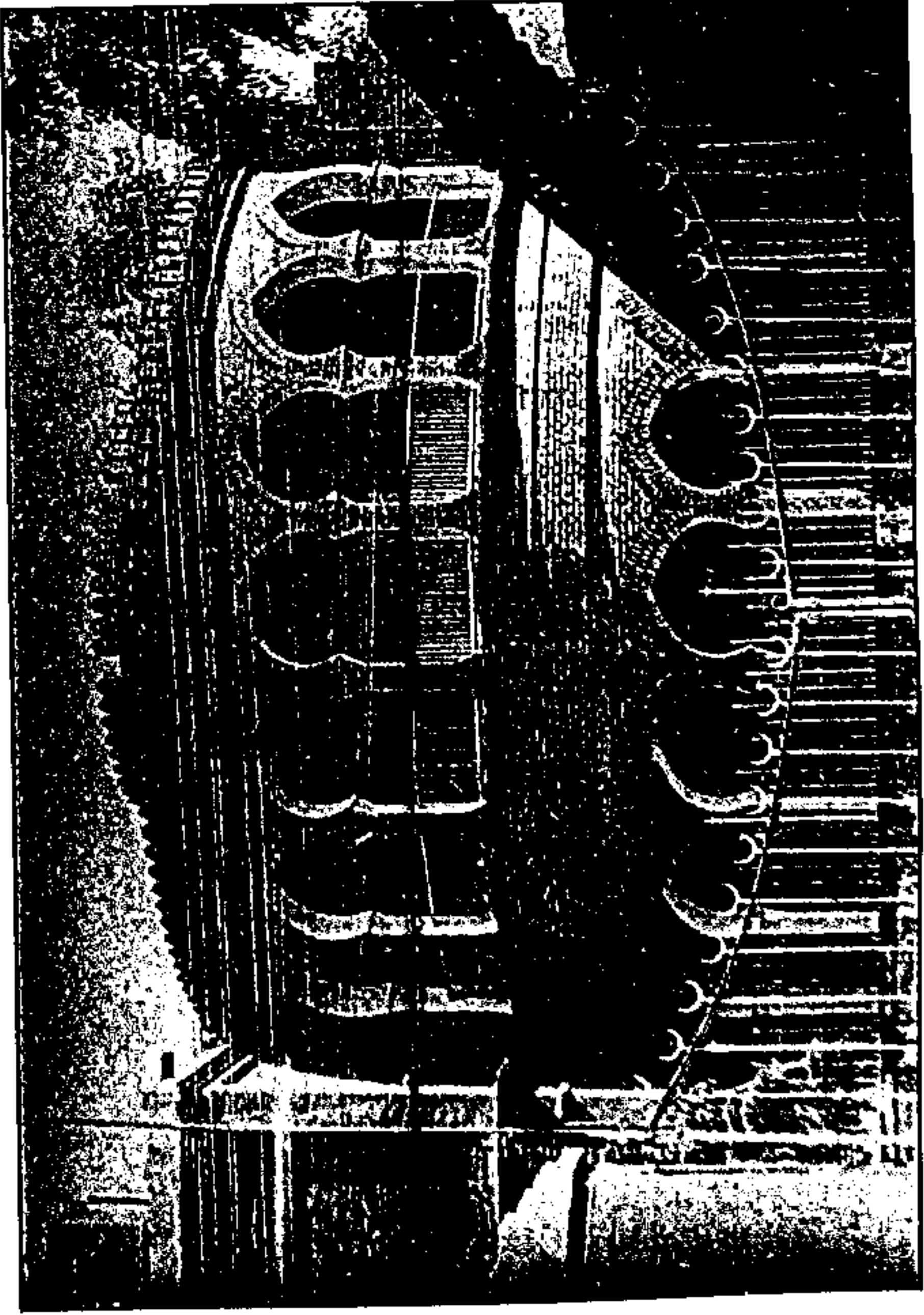
آدم جی پیر بھائی منزل کا سامنے کا منظر
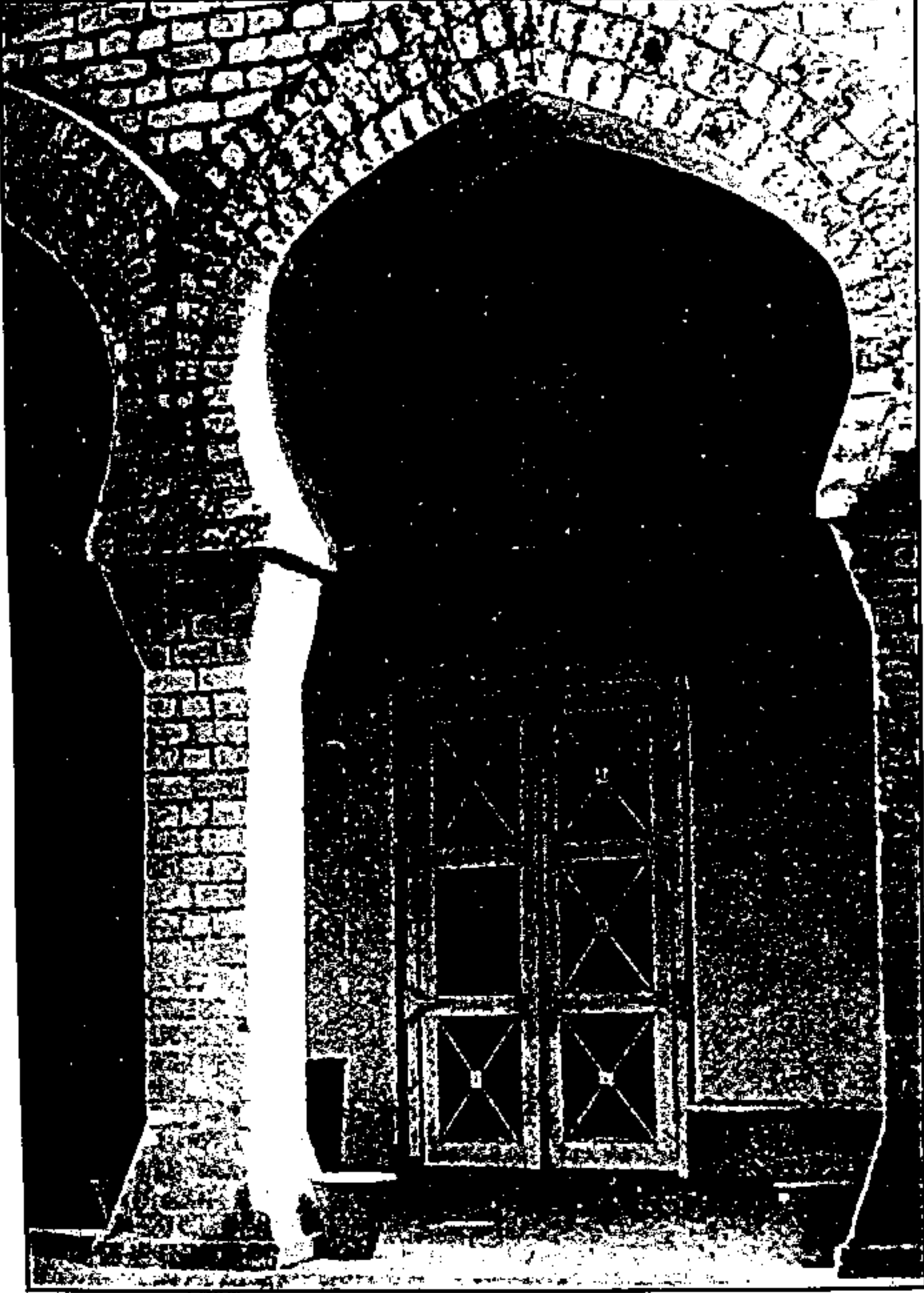
آدم جی پیر بھائی منزل کے اندر یادگار پتھر

ہاشمی بھڑک اُٹھے اور سخت ناراضگی و ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کھانے میں شرکت کیے بغیر اپنے دوست نواب صدر یار جنگ کے یہاں واپس آ گئے۔ واقعہ سن کر صدر یار جنگ آپ کے تقرر کے سلسلہ میں بے حد متفکر ہوئے، لیکن آپ سراپائے استغنا اپنے معمولات میں مصروف رہے۔ صبح حسبِ پروگرام نواب صاحب کی کوٹھی پر جلسۂ سیرت پاک میں آپ کی تقریر ہوئی۔ آپ کے تبحر، جوشِ بیان اور قوتِ استدلال نے عوام تو عوام خواص کو بھی متحیر کر دیا حتیٰ کہ مولوی حسین احمد صاحب مدنی حضرت کی مدلل تقریر سے مبہوت ہو گئے۔ سیّد صاحب سے عرض کر دیا گیا تھا کہ مدنی صاحب سلام و قیام کے قائل نہیں ہیں، آپ نے اسی کو اپنا موضوعِ تقریر بنایا اور آیات و احادیث کی ایسی بوچھار کی کہ خود مولانا دورانِ تقریر تصویرِ حیرت و حیران بنے رہے، اور جب سیّد صاحب صلوٰۃ و سلام کے لیے کھڑے ہوئے، تو مولانا مدنی بھی بے ساختہ اور مودّبانہ کھڑے ہو گئے۔ پھر جب سیّد منبر سے اترے تو مولانا مدنی نے والہانہ انداز میں اُٹھ کر انھیں سینہ سے لگا لیا اور کہا کہ میرا تو خیال تھا کہ مولانا ہدایت اللہ خاں کے یہاں منطق و فلسفہ ہی کا شور و شورہ ہے، آج معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے بحرِ زخار کی شناوری میں ان کے شاگرد تک (نہایت) مہارت رکھتے ہیں۔ مولانا مدنی نے یہ تک کہہ دیا کہ اب مَیں قیام کا قائل ہو گیا۔ نواب صاحب نے اشارہ کیا کہ سیّد صاحب اس داد پر مولانا کا شکریہ ادا کریں۔ آپ نے برجستہ فرمایا 'ان دادوں کی کیا حیثیت ہے؟ مجھے داد اُس بارگاہ سے ملتی ہے جو اپنے محبّ و مولیٰ کی عنایت سے قاسم بھی ہے مختار بھی۔'

آپ کی شخصیت عزتِ نفس، غیرتِ علم، قلندریت اور دانش وری کا مرقع تھی۔ "آدم جی پیر بھائی منزل" کے ایک حصہ کو اپنا بسیرا بنا لینے والے اس مردِ مومن اور صوفی باصفا نے زندگی کی وہ طرح ڈالی جس سے ہزاروں زندگیوں نے روشنی لی اور خود بھی منارۂ علم و عمل بنے۔ وائس چانسلر سر ضیاء الدین آپ کے حضور میں حاضری کو باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اہم مسائل میں آپ کی اصابتِ رائے سے ہمیشہ استفادہ کرتے رہتے تھے۔ ریاضی کی چند گتھیوں کو سلجھانے کے لیے حضرت ہی کے مشورہ پر انھی کی معیت میں سفرِ جرمنی کو بریلی کی طرف موڑ دیا اور چٹکیوں میں حل ہونے والی گتھیوں کے واقعہ پر برِ عظیم کے عظیم ماہرِ ریاضیات ہمیشہ کے لیے نہ صرف حضرت بلکہ امامِ اہلسنّت

کی غلامی کا دم بھرنے لگے۔ پروفیسر ظفر الحسن کے تحقیقی مقالہ کے اصل روح رواں سیّد صاحب ہی تھے۔ علمِ دین کی حرمت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کانووکیشن میں شریک نہیں ہوئے۔

عربی، فارسی اور منطق وفلسفہ کے پروفیسران اپنی گتھیوں کو لے کر طالب علمانہ آتے اور نئی روشنی و نئے عزم کے ساتھ کلاس جاتے۔ گفتگو میں علم وفضل کی جلالت ومتانت کے ساتھ ساتھ خوش طبعی اور مزاح لطیف کی کلیاں بھی کھلتی رہتیں۔ خود فراموشی اور قلندریت نے اگر ایک جانب سادگی اور سادہ مزاجی کا سبق آموز نقشہ پیش کیا، تو دوسری طرف نزاکتِ طبع نے روساءِ وقت کو انگشت بدنداں کر دیا۔ گرمی کی آگ، سردی کی برفانیت، برسات کا طوفانِ بادوباراں ہمیشہ ایک ہی جگہ پر آپ کے قیام گاہ کی استقامت کو چومتی اور آگے بڑھی ہیں۔ صدر یار جنگ جو خود بھی متبحر عالم اور مولٰنا ابوالکلام آزاد جیسے لوگوں سے مراسلانہ ربط رکھتے ہمیشہ عصر ومغرب کی نماز آپ کے فقیر کدہ پر آپ کی امامت میں پڑھتے۔ اور گھنٹوں علمی پیاس بجھاتے رہتے۔ سیّد صاحب کی مرقدِ انور اور قیام گاہ کے سنگِ مرمر پر کندہ کتبے سیّد صاحب کے حضور آپ کی عقیدت بلکہ والہانہ عشق اور کمالِ علم وفضل کے آئینہ دار ہیں۔ سیّد صاحب کی تنہا "المبین" ایک دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا ہے جو ایک نئے فن کی ایجاد کا سرچشمہ اور حضرت کے لسانی اور ادبی نابغیت کی زندہ تصویر ہے۔ اگر آپ اسی پر بس کرتے تو اس سے ہزاروں کتابیں وجود میں آ سکتی اور جنم لے سکتی تھیں۔

آپ نے تصنیفی زندگی میں مقدار، حجم اور تعداد کو نہیں بلکہ ضرورتِ وقت، مسائل کی اہمیت کو فوقیت دی۔ دینی علمی، سیاسی سماجی وغیرہ موضوعات میں جب بے راہ روی، گم رہی اور اسلام وجمہور کو نشانہ بنتے دیکھا فوراً آپ کے قلم نے پتھر کی لکیر کھینچ دی اور زبان وبیان، سلاست وفصاحت کے ساتھ دلائل وبراہین کے وہ انبار لگا دیے کہ مخالف بھی سوچنے اور ماننے پر مجبور ہوا۔ المبین، النور، البلاغ، الانہار، السبیل، الخطاب، الحج وغیرہ آپ کے اس نظریہ تصنیف کے ترجمان ہیں۔

آپ کے مزار مبارک پر یہ زندہ کرامت دیکھنے میں آئی کہ کھجور کا جو درخت مزار انور پر سایہ فگن ہے اس کی تمام شاخیں مردہ اور خشک ہو چکی ہیں، لیکن وہ شاخیں تر وتازہ اور شاداب ہیں،

مزار مبارک کے مقابل لوح پر منظوم تاریخ وصال

مرقد مبارک کا کتبہ

جنھیں خاص مزارانور (یعنی لوحِ مزار یا تعویذ قبر) پہ سایہ فگنی کا شرف حاصل ہے۔

ذیل میں لوحِ مزار کی منظوم تاریخ وصال اور قیام گاہ کی تحریر کی نقل درج کی جارہی ہے۔

مرقد

مولانا سیّد سلیمان اشرف بہاری نظامی فخری میر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی

تاریخ رحلت ۵ ربیع الاوّل ۱۳۵۸ھ روز چہار شنبہ

سلیمان اشرف بر اہل تقوے
بہ علم و عمل والہِ دین اشرف
چو نفسش شنید ایۂ ارجعی را
بہ جنت شد از قربتِ حق مشرف
سنش از دلِ پاک حسرتؔ نوشتہ
بہ جنات عدنِ سلیمان اشرف

۱۳۵۷
۱
۱۳۵۸ھ

از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی
المتخلص بہ حسرتؔ

سیّد صاحب کا مزار مبارک قبرستان مسلم یونی ورسٹی کے شرقی غربی گوشہ میں قبرستان[1] (جس کو منٹو سرکل بھی کہتے ہیں) کی چہار دیواری کے اندر ایک چھوٹی چہار دیواری میں واقع ہے، جو

[1] ''قبرستان کے شمالی حصے میں ایک چار دیواری کے اندر چند قبریں نظر آتی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں قبر مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم کی ہے۔ مولانا شعبۂ دینیات کے سربراہ تھے اور میلاد خوانی کی محفلوں میں خاص طور پر مدعو کیے جاتے تھے۔ ان کا سالِ وفات ۱۳۵۸ھ ہے۔ ''بہ جنات عدنِ سلیمان اشرف'' سے ۱۳۵۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ماہرینِ فنِ تاریخ نے ایک عدد کی رعایت دی ہے۔'' (محمد اسلم، پروفیسر۔ ''سفرنامۂ ہند''، ریاض برادرز۔ لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۷) ناشر

نواب صدر یار جنگ کی خصوصی عقیدت کی نشانی ہے۔ اس چہار دیواری میں نواب فیملی کے علاوہ اور بھی قبریں ہیں جن کی کثرت اگر ایک طرف وفورِ عقیدت وحصولِ فیوض وبرکات کی مظہر ہے تو دوسری طرف زائرین کی حاضری میں سدِراہ بن گئی ہے۔ نیز قبرستان ایک دوسرے عقیدہ کے فرد کے انتظام میں ہے اس لیے مناسب دیکھ بھال اور حفاظت (یعنی Maintenance) کے نہ ہونے سے مستقبل میں بوسیدگی بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

حضرت قدس سرہٗ کی قیام گاہ پر سنگِ مرمر پر کندہ حسبِ ذیل تحریر ہے:

۷۸٦

بیادگار

مولنا سیّد سُلیمان اشرف صَاحِب مرحوم ومغفور

صَدر شعبۂ دینیات مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ متوطن بہار شریف (بہار)

جنھوں نے

تیس (۳۰) سال مُسلسل "آدم جی پیر بھائی منزل" کے اِس حصّے میں

مستقل قیام فرمایا۔ اپنی حمیّتِ دین، فضیلتِ علم، اصابتِ فکر اور

ستودگی سیرت سے اِس درسگاہ کو سَر بلند رکھا اور سَر بلند تر ہے

راہ روانِ شوق از ما سَالہا آرند یاد

نقشہا انگیخت در راہِ محبت گامِ ما

تاریخ رحلت ۵ر ربیع الاوّل ۱۳۵۸ھ مطابق ۲٦ر اپریل ۱۹۳۹ء (حسرت شروانی)
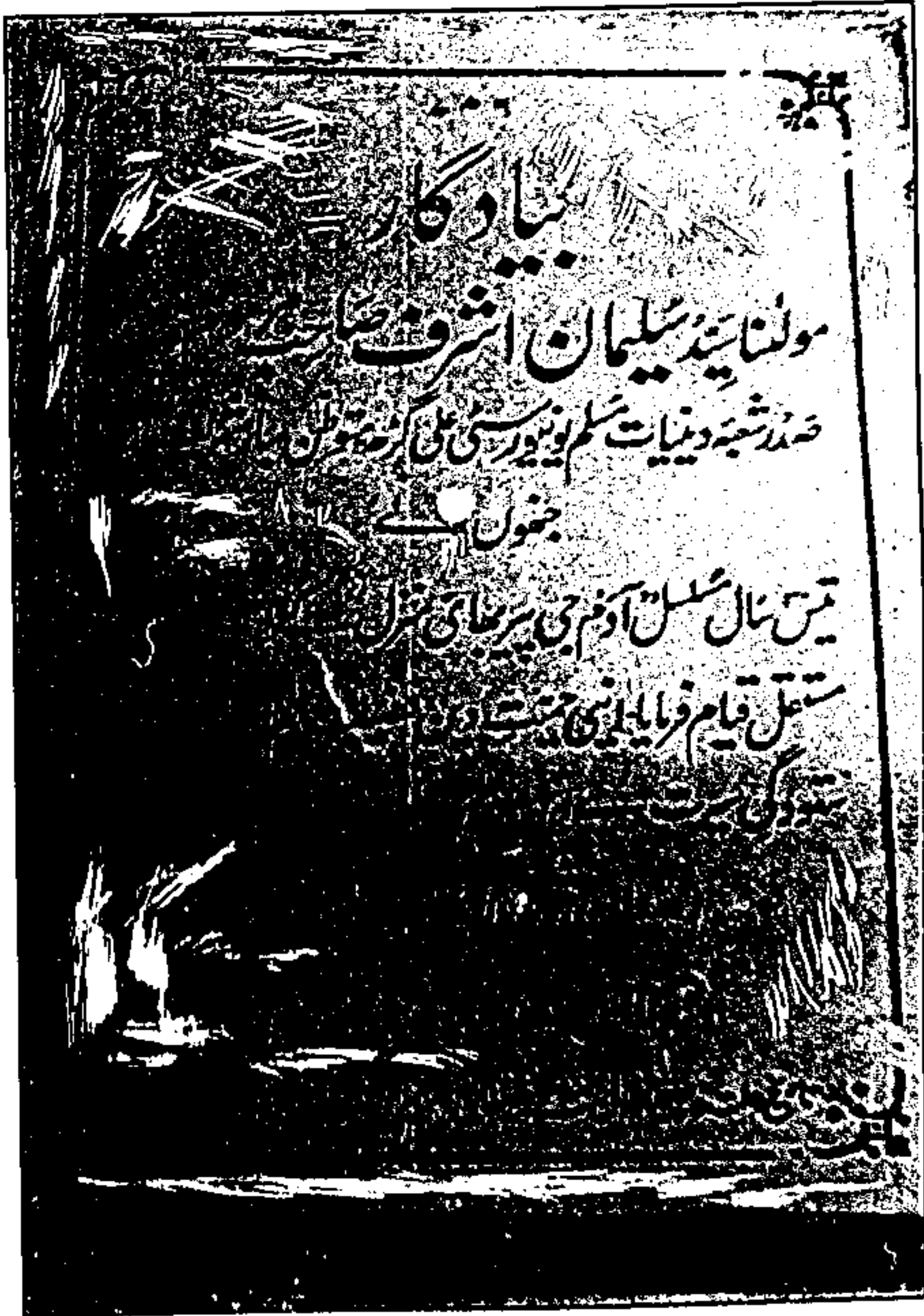
یادگار پتھر کا واضح منظر

سخن ہائے گفتنی

مولانا سیّد سلیمان اشرف گزشتہ صدی کے ان علمائے ذی اکرام میں سے ہیں جن کی ذات علم وعمل کی جامع تھی۔ انھیں علوم شرعی کے ساتھ ساتھ شعروادب سے بھی طبعی مناسبت تھی۔ فلسفہ و معقولات کے ماہر تھے تو لسانیات پر بھی عبور تھا۔ مولانا سلیمان اشرف تقریباً ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں محلہ میر داد (پٹنہ، بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا حکیم سید عبداللہ اپنے عہد کے فاضل طبیب وعالم تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب مخدوم سیّد اشرف سمنانی کچھوچھوی کے بھانجے سیّد عبدالرزاق جیلانی سے جا ملتا ہے، تاہم اس خانوادے کے اراکین مخدوم سمنانی کی طرف منسوب ہو کر اشرفی کہلاتے ہیں، خود مولانا کے نام کے ساتھ اشرف کا لاحقہ اسی نسبت سے ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے اعمام محترم سے حاصل کی۔ مولانا کے چار چچا تھے۔ مولانا عبدالقادر، مولانا عبدالرزاق، مولانا عبدالغنی اور مولانا عبیداللہ۔ چاروں ہی سے مختلف اوقات میں مختلف کتابیں پڑھیں۔ اسی دوران مولوی رمضان علی سے بھی کسب علم کرتے رہے۔ اس کے بعد بہار اسکول میں داخلہ لیا۔ دسویں کلاس تک پہنچے تھے کہ طبیعت دینی تعلیم کی طرف شدت سے مائل ہوئی۔ اسکول کو خیر باد کہا اور مولانا نور محمد اصدقی (خلیفہ اعظم شاہ قیام اصدق، پیر بگہہ جموانواں) سے عربی وفارسی کی تعلیم لی۔ اسی دوران ان کے دامن عقیدت سے وابستہ ہوئے اور اخذ طریقت کیا۔ اس کے بعد مولانا مولانا حکیم سیّد وحید الحق استھانوی (م: ۱۳۱۵ھ) کے قائم کردہ ''مدرسہ اسلامیہ'' استھانواں (قیام ۱۳۰۱ھ) میں مولانا سیّد محمد احسن استھانوی بہاری سے اخذ علم کیا۔ یہ مدرسہ بہار میں دیوبندی احناف کا پہلا نمائندہ مدرسہ تھا۔ یہاں یہ دلچسپ امر بھی لائق ذکر ہے کہ

اس مدرسے کے بانی مولانا سید وحید الحق اور اس کے اوّلین مدرس مولانا سید محمد احسن مشہور اہل حدیث عالم سیّد نذیر حسین محدث دہلوی (م: ۱۳۲۰ھ) کے تلمیذِ رشید تھے۔

"مدرسہ اسلامیہ" کے بعد مولانا نے اپنی تعلیمی زندگی کا کچھ عرصہ مولانا احمد حسن کان پوری کی درسگاہ اور "دارالعلوم ندوہ" میں بھی بسر کیا۔ اس کے بعد "مدرسہ حنفیہ" جون پور میں مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری سے اخذ علم کیا۔ مولانا ہدایت اللہ منطق و معقولات میں اپنے زمانے کے امام تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا نے منطق و معقولات میں اسی خیر آبادی سرچشمۂ علم سے فیض اُٹھایا۔ ان کے اساتذۂ عالی مرتبت کے علاوہ مولانا کے اساتذہ میں ایک قابل ذکر نام مولانا یار محمد بندیالوی (م: ۶ر دسمبر ۱۹۴۷ء) کا بھی ہے۔

مولانا سلیمان معقولات کے عالم، لسانیات کے ماہر، فقیہ و مدرس اور ادیب تھے، لیکن طبعاً وہ اوّل تا آخر ایک صوفی تھے۔ ان کے تصوف کی سب سے بڑی خوبی ان کی سلامت روی اور وسیع المشربی تھی۔ یہاں اس غلط العام خیال کی تردید ضروری ہے کہ مولانا سلیمان اشرف، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تلمیذ و خلیفہ تھے۔ بعض اہل علم نے بربنائے عقیدت مولانا سلیمان اشرف کو فاضل بریلوی کے اجلہ خلفا میں محسوب کیا ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مولانا سلیمان کو فاضل بریلوی سے شدید عقیدت تھی مگر یہ تعلق عقیدت و ارادت تلمذ و خلافت کی نسبت کے بغیر تھا۔ خود مولانا بریلوی نے 'ذکر احباب و دعاء احباب' کے عنوان سے اپنے خلفا کے ناموں کو منظوم کیا ہے جس میں اپنے چودہ (۱۴) اکابر خلفا کے نام درج کیے ہیں ان میں مولانا سلیمان کا نام شامل نہیں۔ اسی طرح جب مختلف حضرات نے خود کو مولانا بریلوی کا تلمیذ رشید و خلیفہ ارشد باور کرانا شروع کیا، تو مولانا بریلوی کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان جعلی خلفاؤں سے اظہار برأت کی جائے لہٰذا انہوں نے ضروری اعلان کے تحت ایک اشتہار شائع کرایا جس میں اپنے پچاس (۵۰) خلفا کے نام درج کیے ان میں بھی مولانا سلیمان اشرف کا نام شامل نہیں۔ اگر مولانا سلیمان، فاضل بریلوی کے خلیفہ ہوتے تو کیا ممکن تھا کہ انھیں نظر انداز کر دیا جاتا؟ مولانا نے مسلم یونی ورسٹی

علی گڑھ جیسی مرکزی درسگاہ میں بیٹھ کر سالہا سال درس وتدریس کی ذمہ داریاں نبھائیں مگر ان کے کسی شاگرد نے اور نہ ہی کسی معاصر نے انہیں مولانا بریلوی کی خلافت سے منسوب کیا حتیٰ کہ مولانا سلیمان کے سوانح نگار محمد علی اعظم خاں قادری نے اپنی کتاب ''حیات وکارنامے۔ سید سلیمان اشرف بہاری'' میں مولانا بریلوی سے ان کی عقیدت کا ذکر تو کیا مگر ان سے نسبت تلمذ وخلافت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

مولانا سلیمان کی وسیع المشربی نے انھیں ہر طبقے میں ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ ان کے مراسم اپنے نقطۂ نظر کے مخالف علما واہلِ علم کے ساتھ بھی بڑے خوشگوار تھے۔ مولانا کا دینی وسیاسی مسلک مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے مسلک کے مطابق تھا۔ اپنے مسلک میں شدت سے وابستگی کے باوجود انھوں نے دوسرے مکاتبِ فکر کے اہل علم کے ساتھ احترام کا رشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ان کی تحریر وتقریر میں کبھی سوقیت طاری نہیں ہوئی۔ اسی طرح اپنے نقطۂ نظر کے مخالف علماء، اشخاص واداروں کے محاسن کا ذکر کرنے سے مولانا کے قلم نے بخل سے کام نہیں لیا۔ عربی مدارس میں اصلاح اور انگریزی کی شمولیت کا خیال سب سے پہلے مولانا ابومحمد ابراہیم آروی (م:۱۳۱۹ھ) کے دل میں آیا تھا جسے انھوں نے عملی شکل (مدرسہ احمدیہ آرہ) میں مرتسم کیا۔ عام طور پر مورخین اس کا ذکر نہیں کرتے۔ مگر مولانا سلیمان اشرف نے باوجود اختلافِ مسلک ومشرب تسلیم کیا کہ:

''اگر خصوصیت ملی اور امتیازِ قومی کی حیاتِ تشنۂ آبِ علوم اسلامیہ تھی تو قوام جسم کا نظام اپنے بقا اور نمو کے لیے انگلش زبان کا بھوکا تھا حکماء امت کی دوربین نگاہوں نے اسے دیکھا اور عربی مدارس کے اصولِ تعلیم میں تغیر وتبدل کے لیے آمادہ ہوگئے خالص مدارس عربیہ میں کچھ انگریزی کی تعلیم داخل کی گئی نیز طریقۂ تعلیم میں بھی سہولت کی راہ پیدا کی گئی۔ فقیر کے علم میں سب سے پہلے مدرسہ احمدیہ آرہ نے اس کی بنیاد رکھی۔ صرف ونحو کی بعض کتابیں سہل اصول پر تصنیف ہوکر وہاں سے شائع ہوئیں اور کچھ انگریزی کا سیکھنا لازم قرار دیا گیا۔'' (السبیل:۲۰)

اسی طرح جب ایک ملحد کی تردید مسئلہ ڈاڑھی پر ''نزہتہ القال فی لحیتہ الرجال'' لکھی تو اس میں مولانا ابو محمد ابراہیم آروی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا ابو عبدالرحمٰن عبداللہ ہزاروی ثم گیلانی وغیرہم کے فتوے بھی درج کیے۔ یہ مولانا سلیمان کی وسعتِ قلبی کی واضح دلیل ہے۔

مولانا مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے لائق تکریم استاد تھے جہاں مختلف الخیال علما و اہل علم موجود رہتے تھے۔ مولانا بھی اس بزم کے ایک رکن تھے۔ مولانا کو ارباب دولت سے کبھی سروکار نہیں رہا۔ اللہ نے انھیں غنائے قلب کی دولت سے نوازا تھا۔ انھوں نے تازیست کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ہی کسی سے اپنے جاہ و مرتبے کی امید باندھی۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج اور بے تکلف تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی، ان کی خودداری اور اپنی عزتِ نفس کا احساس تھا، ان کی ساری عمر علی گڑھ میں گزری، جہاں امرا اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا مگر انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے، جس سے ملے برابری سے ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں۔ علی گڑھ کے عشرت خانہ میں ان کی قیام گاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی، یہاں جو آتا، جھک کر آتا، اگر مجلس سازگار ہوئی تو دعائیں لے کر گیا ورنہ الٹے پاؤں ایسا واپس آیا کہ پھر اُدھر کا رخ نہ کیا۔'' (یادِ رفتگاں:۱۸۹-۱۹۰)

مولانا نہایت نیک نفس تھے، دوسروں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ اپنے استاد کے داماد کو ملازمت دلوائی۔ اور ان کے بیٹے کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہوئے۔ پڑھا لکھا کر انھیں یونی ورسٹی میں ملازمت کے قابل بنایا لیکن پھر اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتے رہے۔ اپنے ایک بھانجے سید معین کی کفالت کی۔ مولانا کے ایک بڑے بھائی سید انیس اشرف جو محکمہ پولیس میں آفیسر تھے ان کا دماغی توازن خراب ہو گیا تھا۔ انھیں اپنے پاس رکھا اور جس جانفشانی سے ان کی

خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بقول سیّد سلیمان ندوی:

''اپنی ضعیف والدہ کی اطاعت اور اپنے ایک دیوانہ بھائی کی رفاقت اور خدمت میں عمر اس طرح گزاری کہ اس کی نظیر مشکل ہے۔'' (حوالۂ مذکور)

مولانا مدت العمر شادی سے گریزاں رہے۔ اپنی والدہ مکرمہ کے شدید اصرار پر آخری عمر میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے مگر کوئی اولاد نہ ہوئی۔

مولانا کے علم و فضل اور ان کے طرز خطابت و وعظ کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ابرار حسین فاروقی لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم و مغفور کے علم و فضل کا اندازہ وہ لوگ خوب کر سکتے ہیں جنھوں نے ممدوح سے درس لیا یا ان کے مواعظ حسنہ سنے۔ ان کا وعظ سیدھے سادے الفاظ میں تصنع، تکلف اور لفاظی کے بغیر بڑا دلکش ہوتا تھا۔'' (ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۷۵ء)

مولانا اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں بڑے جری و بیباک تھے۔ کسی مخالفت کی پروانہ کرتے تھے، جب ہندوؤں کے سیاسی اثر سے مسلمان زعما بھی ذبیحہ گاؤ کو مصلحتاً ترک کر دینے پر آمادہ ہو گئے تو مولانا سید سلیمان اشرف نے اس کی سختی سے تردید کی۔ اپنی گراں قدر کتاب ''الرّشاد'' میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی۔ مولانا سلیمان اشرف کے علاوہ بہار کے جن علما نے ذبیحہ گاؤ کی حمایت میں سرگرمی سے حصہ لیا ان میں مولانا حکیم محمد ادریس ڈیانوی اور مولانا محمد شموئیل عظیم آبادی وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر کی کتاب ''عید المومنین'' کے عنوان سے پٹنہ سے طبع ہوئی جس پر اوّل الذکر کی تقریظ ہے۔

مولانا سلیمان کی زندگی کا ایک قیمتی اور روشن پہلو ملت اسلامیہ کے لیے دلِ دردمند رکھنے والے غم خوار کا تھا۔ ان کا سینہ امت مسلمہ کی زبوں حالی سے غم زدہ تھا اور ان کی آنکھیں زوالِ امت پر اشکبار تھیں۔ وہ دین اور سیاست کی تفریق کے سخت مخالف تھے۔ خود فرماتے ہیں:

''جو مذہب اپنی حفاظت نہیں کرسکتا اور اپنی مامون زندگی کے لیے طاقت روا نہیں رکھتا ہے اُس کا وجود محالاتِ عادیہ میں سے ہے اور وہ ایک فلسفۂ خیالی سے زائد مرتبہ نہیں رکھتا۔ وہ ہاتھ جس میں اخلاقِ حسنہ کی کتاب ہو نہایت ہی مقدس و واجب التعظیم ہے اُس کو بوسہ دیجیے آنکھوں پر رکھیے۔ لیکن سلامت وہی ہاتھ رہ سکتا ہے جس میں خونچکاں شمشیر کا قبضہ دکھلائی دے۔'' (البلاغ، اسلام وخلافت: ۲-۳)

وہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کو ناپسند کرتے تھے اور استعمار کے ہاتھوں کھلونا بننے کو انتہائی معیوب سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کی طاقت کو جب ضُعف و اضمحلال نے آلیا تو استعمار کو دراندازی کا موقع ملا۔

مولانا نے کئی کتابیں تالیف فرمائیں۔ عربی زبان کی اہمیت وافادیت پر ان کی ایک کتاب ''المبین'' ہے جس پر ہندوستانی اکیڈمی نے انھیں ایوارڈ اور پانچ سو روپیہ نقد انعام دیا۔ ''النور''، ''البلاغ''، ''الرشاد''، ''الحج''، ''السبیل'' اور ''نزہتہ المقال فی لحیتہ الرجال'' بھی ان کے تحریری ذخیرے میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ''ہشت بہشت'' پر ان کا فاضلانہ مقدمہ موسوم بہ 'الانہار' فن شاعری میں ان کے درک کا مظہر ہے۔ ''الخطاب'' ان کا لکچر ہے جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ''مسائل اسلامیہ'' کے عنوان سے ان کے مختلف مواعظ کا ایک مجموعہ ان کے تلمیذ مولوی عبدالباسط نے جمع کیا۔ خیال ہے کہ ان کے لکچر کے اور مجموعے بھی شائع ہوئے ہوں گے، تلاش وجستجو کی جائے تو مزید مل سکتے ہیں۔

مولانا سیّد سلیمان اشرف اپنے عہد کے کثیر الدرس مدرس اور وسیع المشرب عالم تھے۔ انھوں نے پوری زندگی اس شان سے گزاری کہ علما کے وقار کو مجروح نہ ہونے دیا۔ تا آنکہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ/ ۲۷ر اپریل ۱۹۳۹ء میں اس عالم رفیع القدر نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انّا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی وفات پر ''علی گڑھ میگزین'' نے اپنی جولائی ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں ان

خیالات کا اظہار کیا:

”یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم میں جوہر قابل اوّل تو پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر شاذ و نادر پیدا بھی ہوتے ہیں تو ان کی ہستی زیادہ پائندہ نہیں ہوتی۔ گزشتہ چند سالوں میں مسلمانوں کو بعض ممتاز ہستیوں کی اچانک موت سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ انھیں میں ایک وہ گوشہ نشین فاضل اجل تھا جس کی ذات سے علی گڑھ میں فیض کا ایک چشمہ جاری تھا۔ الحاج مولانا سید سلیمان اشرف صاحب جو شعبۂ دینیات مسلم یونی ورسٹی کے صدر تھے تھوڑے عرصہ علیل رہ کر رحلت فرما گئے۔ مرحوم مسلسل تیس سال تک تفسیر قرآن کا درس دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں مولانا سے جو فیض ان کے شاگردوں نے پایا اسے انھیں کا دل محسوس کر سکتا ہے۔ مرحوم صوفیانہ وضع کے پابند تھے اور علمائے سلف کا صحیح نمونہ۔ انھوں نے دولت، امارت، حکومت اور شوکت سے مرعوب ہو کر کبھی علم کی توہین نہیں کی۔ مولانا کے متعلق یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ بغیر کسی پس و پیش و تردد کے اپنے خیال اور رائے کا ہر موقع پر اظہار کر سکتے تھے۔ لوگوں کو مولانا سے جو جو فیض پہنچے ان کی داستاں تو بڑی طویل ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مولانا کی وفات سے ہم میں جو کمی ہو گئی اس کے پورا ہونے کی مستقبل قریب میں کوئی امید نظر نہیں آتی۔

خداوندا بیا مرز آں شہید امتحانے را“

یہ جو دوانے سے دو چار نظر آتے ہیں　　ان میں بھی کچھ صاحب اسرار نظر آتے ہیں

ایسے ہی دیوانوں میں ہمارے معاصر دوست جناب ظہور الدین امرتسری کا شمار ہوتا ہے۔ وہ تاریخ برعظیم کا کتابی ذوق رکھتے ہیں۔ کتاب سے محبت ان کی ذاتی علامتوں میں سے پہلی علامت ہے۔ مولانا سلیمان اشرف سے ان کو گہری قلبی وابستگی ہے۔ یہ مولانا سلیمان کی ”روحانی

جلالت''ہی کہیے کہ اپنے روحانی استاد کی طرح ان کا مسلک بھی صلح کل ہے۔وہ اپنے مسلک پر سختی سے کاربند رہنے کے باوجود دوسرے مسالک کے اہل علم سے دوستانہ مراسم رکھتے ہیں، جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے۔

ظہور امرتسری صاحب نے اپنے وسیع المشربی کے باوجود اپنے مسلک کی بذریعہ قلم و قرطاس جیسی خدمات انجام دیں وہ قابل قدر ہے۔مولانا سلیمان اشرف کی کتابوں کی از سر نو طباعت کر کے انھوں نے مولانا کو ایک نئی علمی زندگی دی ہے۔اگر یہ کتابیں وہ شائع نہ کرتے تو مولانا سلیمان کا نام تو یقیناً زندہ رہتا مگر ان کے کام سے لوگ واقف نہ ہو پاتے۔

برعظیم میں ان کے مسلک کے نمائندہ علما کی تاریخ وسوانح اور ان کی مساعیٔ حسنہ کی جستجو ظہور امرتسری صاحب کا خاص موضوع ہے۔اس سلسلے میں ان کی دیوانگی اپنے طبقے کے اہل علم کی فرزانگی پر فضیلت رکھتی ہے۔

باایں ہمہ، ''الخطاب'' کی نقل کے ساتھ یہ چند صفحات میں نے ان کی خواہش پر تحریر کیے ہیں۔دعا ہے کہ اللہ ان کے نیک جذبات کا بہتر صلہ عطا فرمائے اور وہی بہتر اجر دینے والا ہے۔

والسلام مع الاکرام

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

۷/ اکتوبر ۲۰۱۳ء

کراچی

آتیناہ الحکمۃ وفصل

الخطاب

تقریر فقیر محمد سلیمان اشرف

بموقع اجلاس بست و ہشتم کانفرنس

منعقدۂ راولپنڈی

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

۱۹۱۵ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

خطبہ مسنونہ و صلوٰۃ تشہد و تعوذ و تسمیہ کے بعد یہ آیت کریمہ تلاوت کی گئی۔ هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ؕ

بشارتِ فتحِ مبین

یہ آیہ کریمہ آخر رکوع سورۂ فتح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی ایک جماعت ہے جو حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں سعادتِ کونین کی دولت لوٹتی ہوئی مدینہ طیبہ واپس جا رہی ہے۔ بغرض عمرہ رسول کریم علیہ الوف الصلوٰۃ والتسلیم چودہ سو مسلمانوں کو لیکر عازم مکہ معظمہ ہوئے تھے۔ کفار مزاحم ہوئے اور حدیبیہ سے آگے بڑھنا نہ ہوا۔ یہ نہایت دلچسپ واقعہ طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ایک صلح نامہ لکھا گیا جس کے شرائط مسلمانوں پر شاق تھے۔ لیکن سرکار دو عالم کی متابعت اسی میں تھی لہٰذا بسر و چشم منظور تھا۔ مگر اس طرح کی مراجعت نے دلوں کو اس کیفیت کو جس میں ایک سوزش اُس سوزش میں اخلاص اُس اخلاص میں عبودیت کاملہ موجود تھی ذرا چمکا دیا تھا۔ اس پر منافقین کے استہزا و طعن و تشنیع اور بھی نمک چھڑکتے جاتے تھے۔ پس کمال نیازمندی، انتہائے تذلل و انکسار سے قلوب مؤمنین

اپنے اُس قادرِ قیوم کے جناب میں جس کی ہستی و یکتائی کا کلمہ پڑھ چکے تھے ملتجی[1] تھے کہ خداوندا اپنے اس سچے دین کو غلبہ عطا فرما اور کفر و شرک سے اپنے اُس بیتِ معظم و مکرم کو جس کی بنیاد تیرے خلیل نے اپنے ہاتھ سے ڈالی تھی پاک فرما۔ یہ اُن سوختہ[2] دلوں کی آرزوئیں تھیں جنہیں جینا اور مرنا خدا کے لیے سکھلایا گیا تھا۔ جن کی نگاہوں نے وہ کچھ دیکھ لیا تھا جس کے دیکھنے کے بعد تمام فانی زینتیں اور منہدم ہونیوالی لذتیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ اب اُن کی نگاہوں کے آگے جو کچھ تھا سو ایمان و اسلام تھا۔ اسی کی عزت عزت تھی، اسی کی زینت زینت اسی کا بقا بقا، دیگر ہیچ[3]۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ رحمتِ رحمٰن و رحیم اُن کی تمناؤں کو لبیک نہ کہتی۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ[4] (یعنی ہم دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتے ہیں) کا ظہور نہ ہوتا۔ دریائے رحمتِ الٰہی موجزن ہوا۔ غبارِ ملالِ خاطرِ[5] آشفتگان[6] سے دُھلنے لگا، مجروح دلوں پر مرہم کافور رکھا جانے لگا۔ ہنوز مدینہ طیبہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ جبریل امین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور یہ مژدۂ جانفزا اور کلامِ روح پرور سنایا۔ "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا[7]" اے میرے حبیب کھلی اور روشن فتح کا تجھے مالک بنا دیا نعمائے الٰہی کا ہر طرح تجھ پر اتمام ہوا۔ ذرا الفاظ قرآنی کی طرف غور فرمائیے کہ کیسے زوردار لفظوں میں یہ خوشخبری پہنچائی گئی۔ پھر یہ بھی غور کرو کہ فتح کی صفت مبین فرمائی یعنی روشن اور واضح تاکہ دوست دشمن موافق و مخالف سبھی جان لیں کہ سرتاجِ رُسل صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح حاصل ہوئی۔ اور لفظ فتح کو نکرہ[8] لایا تاکہ ہر طرح کی فتح بالعموم رسول کی ملکیت سمجھی جائے۔ علمی، اخلاقی، صنعتی، سیاسی دینی وغیرہ۔ اللہ اللہ ایک وہ نفوس قدسیہ کی جماعت تھی جن کے غبارِ خاطر کو اس طرح رب العزۃ نے دور فرمایا۔ ایک ہم بھی کلمہ گو ہیں کہ جن کے دل سے صدق و صفا ایسا ہی سلب ہو گیا ہے جیسا صحابہ کے قلوب سے معصیت و عصیان۔ پھر جو کچھ ہوا وہ اسی اخلاص کا نتیجہ تھا اور جو کچھ اب ہو رہا ہے یہ ہمارے افعالِ زشت[8] کا ثمرہ ہے

چوں برآری از میانِ جاں خروش — اندر آید بحرِ بخشائش بہ جوش

تا نہ گرید ابر کے خندد چمن — تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن[9]

بہر حال یہ اللہ کا وعدہ تھا جس کا ایک ایک حرف اُن مخلص نیازمندوں کے حق میں صادق ہو کر رہا جنہوں نے رضائے الٰہی کے لیے اپنی ہستی، اپنے جذبات، اپنی تمنائیں سب کی سب گم کر دیں اور پھر وہ سب کچھ پایا جو پانے کے قابل تھا۔ اَللّٰهُمَّ ارْضَ عَنَّا بِحُرْمَتِهِمْ[10] اس آیہ کریمہ کے مضامین کے متعلق

---

۱ ملتجی۔ التجا کرنے والا، درخواست کرنے والا، متمنی، آرزومند، مستدعی (۲) منت سماجت کرنے والا، عاجزی کرنے والا (۳) پناہ ڈھونڈنے والا

۲ سوختہ۔ جلا ہوا (۲) سنجیدہ، موزوں ۳ البقرہ:۱۸۶ ۴ غبارِ خاطر۔ رنجش، ملال خاطر، طبیعت کی کدورت (۲) طبیعت کا اکتا جانا۔

۵ آشفتگان (آشفتہ کی جمع) پریشان، سراسیمہ، پراگندہ، بدحواس (۲) دیوانہ (۳) حیران ۶ الفتح:۱ ۷ نکرہ۔ ناشناس (۲) ناآشنا

(۳) معرفہ کی ضد، اسم عام ۸ زشت۔ بُرا، خراب، زبوں، بھونڈا، بدنما، بدشکل ۹ (مثنوی معنوی۔ رومی) "جب تم تہِ دل سے نالہ و فریاد کرتے ہو تو بخشائش کا سمندر جوش میں آتا ہے، جب تک بادل روئے نہیں، چمن کہاں ہنستا ہے؟ جب تک بچہ نہیں روتا، دودھ کہاں پھوٹتا ہے۔" ۱۰ "اے اللہ تعالیٰ اُن کی حرمت (وقار و تکریم) کے صدقے میں ہم سے راضی ہو جا۔"

ایک مختصر تمہید تھی جس میں اس سورۂ مبارکہ کا شانِ نزول بھی مذکور تھا۔ اس سے یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ انسانی کامیابی کا کیا راز ہے اور کامیاب زندگی کے کیا معنی ہیں۔ لیکن مختلف طبقات کے اشخاص کا خیال کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر واضح تفسیر اس آیۂ شریفہ کی جا رہی ہے۔

حضرت ربّ العزت جل جلالہٗ نے اس آیۂ کریمہ میں اپنی توحید و الوہیت اور نبوت و رسالت کی دلائل قاہرہ بیان کرتے ہوئے اس دینِ الٰہی کے متعلق جس کی ابتدا حضرت آدم سے اور انتہا حضرت خاتم النبیین سے ہوئی حالت بیان فرماتا ہے۔ اس کے بعد اُن خوش نصیبوں کا ذکر اور اُن کے حالاتِ جمیلہ کی مدح فرماتا ہے جنہوں نے نہایت استقامت سے اس دینِ الٰہی کو لبیک کہا تھا۔ مُبارک ہیں وہ بندے جو مصداق اس آیۂ کریمہ کے ہوئے اور قابلِ تقلید ہے وہ حالت جس کی مدح سرائی کلامِ الٰہی میں ہوئی۔ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (ریس کرنے والوں کو اس امر میں ریس کرنا چاہیئے۔) آیۂ کریمہ کے حصۂ اولیٰ (توحید و الوہیت) کے سمجھنے کے لیے ایک مختصر مقدمہ کی ضرورت ہے۔ پہلے اس پر اچھی طرح غور فرمالیں۔

فلسفۂ عملی و فلسفۂ نظری

حضرات! عالم میں جس قدر چیزیں کہ پائی جاتی ہیں خواہ جوہر ہوں یا عرض وہ دو حال سے خالی نہیں بعض تو ایسی ہیں جن کا وجود ہماری قدرت و اختیار میں ہے جیسے علم صدق دیانت وغیرہ وغیرہ۔ اور بعض ایسی ہیں جن کا وجود ہماری قدرت و اختیار میں نہیں جیسے آفتاب زمین ضوء شمس و قمر وغیرہ وغیرہ۔ پہلے قسم کے علم کو فلسفۂ عمل اور دوسرے قسم کے علم کو فلسفۂ نظر کہتے ہیں۔ پہلے قسم کو فلسفۂ عمل اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں مجرد علم کمالِ نفسانی کے لئے کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ اُس پر عمل ہونا بھی شرط ہے۔ مثلاً ایک شخص انفاق کے معنی جانتا ہے اور اس کے فوائد کا بھی اسے علم ہے لیکن اس پر عمل آرا نہیں ہوتا تو عمر بھر اسے وہ فوائد حاصل نہ ہونگے جو انفاق سے وابستہ ہیں اور یہ علم قطعاً اُس کے نفس کو مہذب نہ بنائیگا۔ پس حکمتِ عملی کے لئے ضرور ہے کہ اولاً اچھی باتوں کا علم حاصل کیا جائے اور بعد علم کے اُس پر عمل کی عادت ڈالی جائے تاکہ نفس اُن پاکیزہ عادتوں پر ملکہ ہو جائے۔ رہا فلسفۂ نظر سو یہاں صرف علم موجب کمالِ نفس ہوتا ہے یعنی ایسے موجودات جن کا وجود ہماری قدرت و اختیار میں نہیں ہے۔ اُن کے حقائق کا علی قدر طاقتِ بشری جاننا کمالِ نفس کے لیے کفایت کرتا ہے۔ آج دنیا میں انہیں حقائق کے انکشافات کا نتیجہ محیر العقول کرشمے تم دیکھ رہے ہو۔ فَسُبْحَانَ الَّذِیْ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (پس پاک ہے وہ ذات جس نے انسان کو وہ باتیں سکھلا دیں جنھیں وہ نہ جانتا تھا۔)

۱. انطیف:۲۶ ۲. مجرد۔ اکیلا تنہا (۲) وہ شے جو مادّہ سے پاک ہو، جیسے روح، فرشتہ ۳. معمل۔ عمل پیرا، راستہ چلا ہوا ۴. حکمتِ عملی۔ پالیسی، کام کرنے کی حکمت، دور اندیشی ۵. موجودات (موجود کی جمع) مخلوقات، دنیا، کائنات، وہ تمام چیزیں، جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں، نیچر ۶. انکشافات (انکشاف کی جمع) دریافت (۲) کھلنا، ظاہر ہونا ۷. قولہ تعالیٰ: عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (علق:۵)

بعد اس کے کہ فلسفہ عمل و فلسفہ نظر کی تعریف و غایت[1] معلوم ہو چکی ہیں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ جس نے اپنے آپ کو فلسفہ عمل سے متصف[2] کیا ہو گا کیا اُس کی نظر سے یہ بات چھپی رہ سکتی ہے کہ جس نے اس شئے کو پیدا کیا اور ان صفات و اخلاق سے نفس کو متصف کرنے کی ہدایت فرمائی بیشک وُہ ایک بڑا حکیم و علیم ہے۔ ہاں یہ امر بھی یہاں پر سمجھ لینے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جسقدر جذبات و قوتیں کہ ودیعت فرمائی ہیں ان میں سے ہر ایک ضروری و انتہائی درجے کی مفید ہے۔ اُن کا بیجا استعمال بے محل صرف البتہ انھیں مذموم بنا دیتا ہے۔ مثلاً ایک جذبہ غیرت ہے کہ جب تک اس جذبہ کو اُس صحیح دائرہ تک رکھیئے محمود ہے لیکن افراط کے مرتبہ میں پہنچکر غضب و جنوں کہا جاتا ہے اور تفریط میں آکر بے غیرتی و بے حمیتی۔ جسقدر غور کرو گے اُسی قدر یہ مسئلہ واضح ہوتا جائیگا کہ افراط و تفریط سے اگر کام نہ لیا جاوے تو پھر انسان میں کوئی جذبہ و قوۃ مذموم نہیں اور جذبات کو اعتدال پر قایم رکھنا اصل کمال انسانی ہے۔ اب کیا وہ شخص جسکی زندگی کا دستور العمل[3] فلسفہ عمل ہو کیا اس امر کا اعتراف نہ کریگا کہ جس نے ان جذبات و قوتوں کو پیدا کیا وہ ایک عجیب بے مثل ذات ہے اور اُس کی حکمت کی حقیقت تک پہنچنے سے انسان عاجز ہے۔ اسی طرح جس نے کائنات کے صحائف[4] کا مطالعہ کیا ہو گا اور جمادیات[5] و حیوانات[6] ان میں سے کسی کی صنعت کی طرف غور و فکر سے کام لیا ہو گا تو قدرت کے عجائبات نے اُس کی عقل کو متحیر فکر کو سلطہ بنا دیا ہو گا۔ اور بیساختہ اُس کے منہ سے یہ نکل گیا ہو گا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

مشاہدہ اشیا سے سبق

صبح کے وقت کسی چمن میں جاؤ وہاں کا سماں دیکھو سبزوں کا لہلہانا غنچوں کا شگفتہ ہونا مختلف پھولوں کا مختلف رنگ و بو کا پایا جانا کیا یہ سب تمھیں اس طرف رہبری نہ کرینگے کہ عالم کا کوئی صانع ہے۔ ایک گلاب کا پھول کیلو۔ اُس کی نزاکت اُس کی باس اُس کی رنگت، اُس کی پنکھڑیاں اُن پنکھڑیوں کی ترتیب کے ریشے کیا اپنے خالق کا پتہ نہیں دیتے ہیں یا اُس کے کمال صنعت کو اپنے وجود سے ثابت نہیں کرتے صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مستحکم بنایا ہے کیا کسی نے آج تک ایک پھول بھی ایسا بنایا جو ان تمام صفات ظاہری و باطنی میں گلاب کے مانند ہو اور اسی طرح اپنے آپ میں روح نباتی بھی رکھتا ہو۔ ہرگز نہیں۔ اطبا سے پوچھو تو تمھیں معلوم ہو کہ گلاب اپنے رنگ و بو حسن و جمال کے علاوہ کیا کیا خواص رکھتا ہے۔ کتنے امراض میں کام آتا ہے اور کس کس طرح بہترین ادویات کا جزبنکر صحت و راحت انسانی کا سبب ہوتا ہے۔ کسی بڑے سے بڑے

---

[1] غایت۔ انتہا، غرض، مطلب (۲) آخر، انجام [2] متصف۔ صفت کیا ہوا (۲) تعریف کیا گیا، موصوف جس کے ساتھ کوئی وصف لگا ہو۔
[3] دستور العمل۔ قاعدہ (۲) قانون جس کے مطابق چلنا چاہیے (۳) ہدایت نامہ (۴) کام کا طریقہ [4] صحائف (صحیفہ کی جمع) کتابیں (۲) لکھے ہوئے صفحات، اوراق [5] جمادیات (جمادات۔ جماد کی جمع) بے جان چیزیں جن میں حس و حرکت اور نشو و نما کی قوت نہیں، جیسے دھات پتھر مٹی وغیرہ [6] حیوانات (حیوان کی جمع) زندہ جان دار (۲) زندہ ہونا

فلسفی سے التجا کرو یا کسی ماہر علم نبات سے التماس لاؤ کہ ایک پھول بھی ایسا بنا دے جس میں گلاب جیسے اوصاف پائے جائیں۔ اچھا اگر تمام عمر کی کوشش سے ایک پھول اُس نے بنا بھی لیا تو یہ خواص اُس میں پیدا نہ ہونگے۔ اور بفرضِ محال اگر اُس میں خواص کچھ مان بھی لیے جائیں تو اُس کے استعمال میں یہ تنوعاتِ[1] مفیدہ نہ پائے جائینگے۔ اور سب کچھ سہی مگر وہ حیاتِ نباتی جو اپنے آپ میں ایک گلاب کا پھول رکھتا ہے وہ کہاں سے پیدا ہوگی۔ ایک طرف ماہرانِ فن کا یہ عجز دوسری طرف اُس قادر و قیوم کی قدرت کا یہ جلوہ کہ ہر صبح کو کروڑوں پھول اُسی آب و تاب اُسی خواص و طبائع کے ساتھ چمنستانِ عالم میں شگفتہ ہو کر اپنے خالق کی تسبیح و تقدیس زبانِ حال سے کرتے ہوئے کچھ دیر اپنی بہار دکھا کر کل کے آنیوالوں کے لیے جگہ خالی کر رہے ہیں۔ اور ایک غیر محسوس طرز پر اُسی کے پاس چلے جا رہے ہیں جس نے انھیں یہاں چند ساعتوں کے لیے بارونق بنا کر بھیجا تھا۔ فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ[2] ہ (پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور تمام اشیا اُسی کی طرف لوٹتی جاتی ہیں) اِسی طرح ایک علم الابدان کے ماہر کو لو اور اُس سے پوچھ دیکھو کہ تشریحاتِ اعضائے انسانی میں اُس کی عقل نوادرات[3] کا مشاہدہ کرتے ہوئے کیسی متحیر رہ جاتی ہے۔ ایک ایک عضو اپنی صورت بلحاظ اپنے خواص اپنے افعال اور اپنے محل وقوع کس حکمت سے مخلوق کی گئی ہے۔ مثلاً آنکھ کی پہلی ساخت کی طرف غور کرو اُس کی نزاکت کو دیکھو پھر اُس کے محل وقوع پر نظر ڈالو پھر قدرت نے جو اُس کے محفوظ رہنے کی تدابیر عمل میں لائی ہیں اُسے سوچو اُس کے بعد دیکھنے کے فلسفے پر فکر دوڑاؤ اور اس دیکھنے کے لیے خالق نے آنکھ میں کیا کیا کل پرزے بنائے ہیں اُسے مطالعہ کرو پھر تم خود ہی کہہ اُٹھوگے کہ سراپا حکمتوں سے مرصع[4] وجود محض امتداد[5] دہر یا اتفاقات ایام یا تنوعاتِ حرکت کا نتیجہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ یہ ترتیب و یہ نظام کسی بڑی قدرت والے ذی اختیار کا کام ہے بیشک ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ[6]

قرآن اور فلسفہ عملی و نظری

حضرات! اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے اُس کتاب آسمانی کی عظمت جسے ہمارے پیغمبر روحی فداہ ہم میں امانت فرما گئے ہیں ظاہر کروں۔ دیکھیئے فلسفہ[7] نظر کا جاننے والا مرتبے میں فلسفہ عمل کے عالم سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ فلسفہ نظر میں جو حصہ کہ سب سے اہم ترین و معرکتہ الآرا ہے وہ فلسفہ الٰہی ہے تو اب مجھے یہ بتلانا ہے کہ جس طرح سے کتاب اللہ نے فلسفہ عمل میں ہمیں تمام فلاسفہ[8] کی تصانیف سے بے نیاز کر دیا ہے اُسی طرح فلسفہ نظر کے

---

1. تنوعات (تنوع کی جمع) طرح طرح کا ہونا، قسم بہ قسم ہونا، گوناگونی 2. المؤمنون: ۸۳ (فری) 3. غالباً یہ لفظ نوادرات (؟) ہے۔ 4. مرصع۔ آراستہ 5. امتداد۔ زمانہ، مدت، مدت گزرنا، درازی (۲) دراز اور کشیدہ ہونا 6. الانعام: ۹۶، یٰس: ۳۸، حم السجدۃ: ۱۲ میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ 7. فلسفہ۔ لاطینی، علم حکمت، دانائی (۲) فیلسوف یعنی حکیم و دانش مند ہونا (۳) علم اشیائے موجودات مع علت و اسباب 8. فلاسفہ (فلسفی کی جمع) حکما، دانش مند لوگ

حصۂ الٰہیات[1] میں ہم کسی کے محتاج و مستمند[2] نہیں ہیں۔ فلسفۂ الٰہی کا بڑے سے بڑا عالم جہاں تک پہنچا ہے یا پہنچیگا آج سے چودہ سو برس قبل ہمیں قرآن مجید وہاں تک پہنچا چکا ہے۔ اس کو ذرا واضح طور پر یوں سمجھیے کہ وجود باری پر حکمائے جو دلائل کہ قایم کیے ہیں وہ تین نوعیتوں میں منحصر ہیں۔ امکان[3]، حدوث[4]، اور نظام و ترتیب۔ یعنی جواہر[5] و اعراض کا ممکن ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے وجود کا رائج کرنیوالا کوئی ہے اور وہ خود دائرۂ امکان سے خارج ہے، ورنہ دور و تسلسل لازم آئیگا اسی طرح جواہر و اعراض کے تغیر سے اُن کے حدوث پر دلیل لاتے ہیں اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ہر حادث کیلیے ایک محدث چاہیے جو خود حادث نہو بلکہ قدیم ہو۔ ورنہ وہی خرابی دور و تسلسل کی یہاں بھی لازم آئیگی۔ تیسرا طریقہ نظام عالم سے استدلال کرنے کا ہے۔ حکما اس کی تقریر یوں کرتے ہیں کہ تمام جسم خواہ فلکی ہوں یا عنصری جسم و لوازم جسم میں یکساں ہیں۔ پھر اُن کا باعتبار صفات و اشکال و مقادیر و اکنہ و احیاز مختلف ہونا کس سبب سے ہے۔ جسم اور اُس کے لیے لوازم کو تو کہا جا نہیں سکتا۔ اس لیے کہ جسم من حیثیت جسم اور لوازم جسم من حیثیت لوازم جسم کا اقتضا یکساں ہے۔ یہ اتفاق کو چاہیگا نہ کہ اختلاف کو پھر اب جو اختلاف پایا جاتا ہے تو وہ کسی امر منفصل کے جہت سے ہے۔ جو نہ جسم ہے نہ اس سے متعلق ہے پھر وہ مجبور بھی نہیں ہوسکتا اس لیے کہ مجبور تو مجبور ہے اُس سے صدور افعال کیونکر ہوگا۔ لامحالہ قادر و مختار ہے۔ پس وہ ذات جو قادر و مختار ہے اور جسم و جسمانیت سے پاک ہے اُس کا وجود ضروری ہے تاکہ اجسام کے مختلف صور و صفات وغیرہ وغیرہ سے نظام عالم قایم رہے اور وہی اللہ ہے۔ یہ منطقی پُر پیچ تقریر کوئی سمجھا ہوگا اور کوئی اُلجھ کر رہ گیا ہوگا کہ یہ کیا لغو اس و چیتاں ہے اور جس نے سمجھا بھی ہوگا تو اُس کے قلب کو سکون پیدا ہوا ہو یا نہوا ہو۔ اب آئیے اس طرف۔ ہم آپ کو یہ دکھلائیں کہ قرآن پاک کس طرح ہمیں اس اہم مسئلہ کو سمجھاتا ہے۔ اَللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ بے نیاز ذات اللہ تعالیٰ کی ہے اور تم سب کے سب محتاج ہو۔ ذرا اسی آیہ پر غور کرلو یہ ہر شخص جانتا ہے کہ انسان سراپا احتیاج و مجسمۂ حاجت ہے۔ اب یہ اپنی حاجتوں کو رفع کرنے کے لیے جس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ سب مخلوقات الٰہی ہیں۔ اور وہ بھی اپنے وجود کے بقا اور حفظ تشخص میں کسی کی طرف محتاج ہیں۔ دیکھو یہ وہی امکان کا مسئلہ ہے مگر حکما کے یہاں دور و تسلسل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور قرآن نے ایک دلکش جملہ اَللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ فرما کر ہمارے امکان ہمارے تغیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا قدیم و قادر ہونا بھی ثابت کردیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ احتیاج و درماندگی میں تمھارا اصل مرجع کون ہونا چاہیے

۱ الٰہیات۔ علم الٰہی مطابق فلسفہ حکمت/علم الٰہی جو علم حکمت کی ایک قسم ہے (۲) علم الٰہی کے مسائل ۲ مستمند۔ حاجت مند (۲) حاجت

۳ امکان۔ ہوسکنا، ممکن ہونا (۲) کسی شے کے عدم وجود دونوں کا ضروری نہ ہونا (۳) قدرت، طاقت، مجال، مقدرت، مقدور (۴) قادر کرنا، اختیار، قابو، مرتبہ دینا (۵) قدم کے برعکس، عالم فانی، ناپائدار دنیا ۴ حُدوث۔ عدم سے وجود میں آنا، نیا پیدا ہونا (قدیم کی ضد)

۵ جواہر (جوہر کی جمع) ہر قیمتی/بیش قیمت پتھر مثلاً یاقوت، ہیرا، لعل، گوہر وغیرہ (۲) ہر چیز کی اصل، ہر چیز کا خلاصہ، کسی چیز کی وہ صفت جو اُس کے ساتھ

قرآن کا طرزِ استدلال

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا قصہ قرآن پاک میں موجود ہے آپ نے چار مرتبہ مناظرہ فرمایا پہلا مباحثہ بظاہر اپنے نفس سے تھا اور حقیقت میں قوم مخاطب تھی۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے۔[1] فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (جب کہ رات کی تاریکی نے چھپالیا اور ستارے درخشاں ہوئے تو اس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب کہ وہ غروب ہوگیا تو اس نے کہا کہ میں غروب ہوجانے والے کو پسند نہیں کرتا) دوسرا مباحثہ اپنے باپ سے فرماتے ہیں۔[2] يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا (اے باپ جو چیز نہ دیکھ سکے نہ سن سکے نہ تجھے کچھ بھی کسی سے بے نیاز کرسکے اس کی عبادت کیوں کرتا ہے) پہلے مباحثہ میں حدوث وتغیر سے صانع عالم پر استدلال کرتے ہیں۔ دوسرے میں مجبوری باطل معبودوں کی ظاہر فرماکر اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ معبود کو قادرِ مطلق ہونا چاہیئے۔ تیسرا مباحثہ قوم سے ہے۔[3] مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (یہ مورتیں جنکی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہوئے ہیں کیا چیز ؟) یہاں یہ بحث پیش کرتے ہیں کہ مخلوق کسی حال میں معبود نہیں ہوسکتا معبود کسی کے بنانے سے نہیں بنتا بلکہ معبود تو وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ اور ان تمام چیزوں کو نیست سے ہست بنادیا۔ چوتھا مباحثہ نمرود سے ہے۔[4] اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (جب ابراہیم نے نمرود سے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ تو اس نے کہا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں تب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب مشرق سے آفتاب کو طلوع کرتا ہے تو اسے مغرب سے نکال دے پس کافر حیران ہوکر رہ گیا۔ اللہ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا) یہ دلیل نظام[5] و ترتیب[6] عالم سے ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ کی زبان سے جن دلائل کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے ان کی سادگی کو دیکھو۔ پھر اس کو خیال کرو کہ کس طرح دل میں گھر کر جانے والے استدلالات[7] ہیں۔ پس میرا یہ کہنا کہ حکمائے دہر کی عقلیں انتہائے کار میں جہاں پہنچیں اور ان کے فکر کی جو آخری منزل ہوئی۔ وہ ان کے لیے اگرچہ کتنا ہی مایۂ ناز و فخر ہوا ہو۔ لیکن ہمیں تو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے دوسوکھے پہاڑوں میں دل نشین افروز ہوکر یہ سب کچھ پڑھا دیا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى هٰذَا النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔[8]

حامیانِ علومِ عقلیہ کا ایک مغالطہ ہاں اس قدر اور بھی گزارش کرونگا کہ جہاں کہیں بھی الہیات کا باب

---

[1] الانعام:۷۶ [2] مریم:۴۲ [3] الانبیاء:۵۲ [4] البقرۃ:۲۵۸

[5] نظام۔ سلسلہ، ترتیب (۲) بندوبست، انتظام (۳) رسم، عادت (۴) جڑ، بنیاد [6] ترتیب۔ ہر چیز کو اس کے ٹھکانے اور مناسب موقع پر رکھنا، موزوں جگہ پر رکھنا، درجہ بدرجہ ٹھیک رکھنا/کرنا، درستی، آراستگی [7] استدلالات (استدلال کی جمع) دلائل، براہین، دلائل یا اسناد لانا (۲) دلائل چاہنا/طلب کرنا (۳) دلائل قائم کرنا (۴) گواہی دینا۔ [8] "اے ہمارے معبود اس نبی امی پر درود وسلام اور برکتیں نازل فرما۔"

ہیں حکما کی رائیں راستی کی طرف گئی ہیں وہ شمع نبوت کے نور ہی کا جلوہ ہے۔ نبیوں کے منہ کی نکلی ہوئی باتیں
جب ان حکما تک پہنچیں تو اس کی مقاومت[1] کی طاقت اپنے میں نہ پاکر انھیں باتوں کو اپنے الفاظ کے
قالب میں ڈھال لیا۔ چند رعب دار مصطلح[2] الفاظ کی ثقالت[3] سے اسے پُرپیچ بنا کر اپنا کہکر لوگوں کے سامنے
لے آئے۔ اب جو کوئی اس کو پڑھتا ہے ان کے کمالِ عقل و فکر رسا ہونے کا قائل ہو کر ان کے قول کی عظمت
کرنے لگتا ہے۔ اس طرح ان کی وہ تمام باتیں جو ان کی اختراعیات[4] ہوتی ہیں اور ان کے مظنونات[5] وقیاسات
کا صرف ایک انبار ہوتے ہیں وہ سب کو صحیح جاننے لگتا ہے۔ یہ پہلا مغالطہ ہے جو حامیان علوم عقلیہ کو
پیش آتا ہے۔ اور جب تک اس غلطی کا ازالہ نہیں ہوتا اور ان کے قدم اپنے دائرہ وحدود کے اندر نہیں آتے
اُس وقت تک ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ جب علوم کی اساس ہی غلطی پر ہو تو پھر صحت نتیجہ کی امید ہی
عبث ہے ۔ خشتِ اول چون نہد معمار کج ٭ تا ثریا می رود دیوار کج۔[6]

دوستو! اس مسئلہ کا بیان ذرا واضح ہونا چاہیئے تاکہ اگر کوئی مسلمان کی اولاد اس غلطی میں مبتلا
ہو تو اسے تنبیہ ہو جائے۔ دیکھئے جب ہم ایک مہندس[7] کے پاس بیٹھتے ہیں اور ریاضیات کے مسائل میں
اسکی موشگافیاں[8] اور پرپیچ اشکال میں اس کے ذہن کی جودت[9] دیکھتے ہیں اور پھر نتائج صحت کیساتھ یقین
دلانے والے ہوتے ہیں تو ہمارا دل اس کی عظمت وکمال کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس کے صحیح العقل
وفکر رسا کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اب وہ اپنے حدود ومعلومات وتجربے سے قدم باہر نکالتا ہے اور مذہب کے میدان
میں آتا ہے۔ یہاں آکر اپنی بیباکی سے کچھ کہتا ہے تو ہماری عقیدت سابقہ اس امر پر ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس
ماہر کی تحقیق سے انکار نہ کیا جائے۔ جس کی عقل ایسی دُوربین ہو گیا اس کی نظر سے ایسی جلی باتیں مخفی رہ
سکتی ہیں؟ نہیں کبھی نہیں۔ بس یہی فیصلہ تمام اغلاط کا سنگ بنیاد ہو جاتا ہے۔ حالانکہ تھوڑے سے غور وفکر سے
کام لیا جائے تو یہ مسئلہ نہایت ہی آسانی سے صحیح اصول پر فیصل ہو سکتا ہے یعنی ایک شخص جو ریاضی کا جاننے
والا ہے وہ امراض کی تشخیص اور معالجہ کی تجویز میں جب کہ بالکل عاجز ہے اور اس کی عقل نہ تو ایک محموم[10]
کی تپ کی نوعیت متعین کر سکتی ہے اور نہ اس کا علاج تجویز کر سکتی ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مذہب کے
باب میں اس کی رائے ویسی ہی وقیع سمجھی جائے جیسی کہ علم ریاضی میں۔ نیز اگر کوئی بہت بڑا ریاضی داں
اعلیٰ درجہ کا طبیب حاذق بھی ہو تو کیا تشخیص امراض وتجویز علاج کے وقت اس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ
اپنی تشخیص وتجویز پر اسی طرح قطعی دلائل قایم کریں جیسا کہ آپ علم ہندسہ کے متعلق کیا کرتے ہیں۔

۱ مقاومت۔ کسی کے مقابلے کو آمادہ ہو جانا، کسی سے برابری کرنا (۲) مقابلہ ۲ مصطلح۔ اصطلاح کیا ہوا، اصطلاح، محاورہ ۳ ثقالت۔ وزن، بوجھ، گرانی، بھاری پن ۴ اختراعیات (اختراع کی جمع) نئی بات نکالنا/ پیدا کرنا، ایجاد کرنا، نئی چیز نکالنی/ بنانا (۲) پھٹنا، پھاڑنا (۳) جی سے جوڑنا ۵ مظنونات (مظنون کی جمع) ظن (گمان) کیا گیا/ کیا ہوا (۲) مشکوک، مشتبہ، شکی ۶ "جب کوئی معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو دیوار آسمان تک جائے پھر بھی ٹیڑھی ہی رہے گی۔" ۷ مہندس۔ اشکال ہندسہ/ علم ہندسہ کا عالم، اقلیدس کا ماہر (۲) انجینئر
۸ موشگافی۔ چھان بین، باریک بینی، نکتہ چینی، (۲) بال کی کھال کھینچنا ۹ جودت۔ فراست، تیزفہمی، ذہانت، ذکاوت (۲) اچھائی، خوبی، عمدگی (۳) پالاکی، تیزی (۴) چست ہونا (۵) نیکی ۱۰ محموم۔ وہ شخص جسے تیز بخار ہو۔

الغرض یہ امر بداہتاً[1] ثابت ہے کہ ہر وجود کا ثبوت ایک ہی نوعیت پر نہیں ہو سکتا ہے۔ نیز ایک فن کی مہارت سے دوسرے فن کا علم لازم نہیں آتا ؎

پوریا باف گرچہ بافندہ است
نبرندش بہ کارگاہ حریر [2]

فیثاغورث کی ایک حکایت

ایک واقعہ بطور مثال گزارش ہے۔ فیثاغورث جو ایک بڑا حکیم دورِ قدیم میں تسلیم کیا گیا ہے اور جس کی تحقیقات پر آج یورپ کی انتہائے فکر نے قرار پکڑا ہے (یعنی یہ کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے) اس مسئلہ کی اہمیت اس کے ذہن کی حدت[3] کی کافی شہادت ہے۔ لیکن مذہب میں آکر ایسی فاش غلطی کرتا ہے کہ تمام فلسفہ یہاں دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ یہ حکیم تناسخ[4] کا بھی قائل تھا۔ ایک دفعہ کوئی شخص ایک کتے کو مار رہا تھا اور کتا چیختا جاتا تھا۔ فیثاغورث وہاں سے گذرا۔ اس نے اس شخص سے کہا کہ اس کتے پر میری وجہ سے رحم کر۔ اس میں میرے ایک دوست کی روح نے جسم لیا ہے اور میں اسے پہچانتا ہوں۔ قابل غور ہے کہ اولاً تناسخ کا قائل ہونا۔ پھر ایک کتے میں اپنے دوست کی روح کا حلول[5] یقینی طور پر تسلیم کرنا اور اسے اذعان[6] کے ساتھ پہچاننا اور اس بنا پر رحم کا خواہاں ہونا، کیا بچوں جیسی باتیں نہیں ہیں؟ ایسا زبردست حکیم اور اس طرح کی باتیں۔ اس سے عقل انسانی کی پرواز معلوم ہو جاتی ہے۔

لمعاتِ کلام ربانی

یہ مضامین جو مشتے نمونہ از خروارے بیان کیے گئے ان سے مقصود صرف اسقدر تھا کہ کلام ربانی کے لمعات[7] آج بھی فلسفہ جدیدہ کے سامنے ویسے ہی درخشاں و نور افشاں ہیں جیسے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے تاباں و ضیا افگن تھے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ [8]

بلکہ صحیح فلسفہ دانی کا نتیجہ توحید و الوہیت کا اعتراف ہے۔ اور قرآن مجید کے ساتھ دل بستگی و شیفتگی نہ کہ وجود باری کا انکار اور فہم و تلاوت کلام اللہ سے بیگانگی و بیزاری۔

اب بعد عجب لیجئے دلائل توحید و الوہیت کے ایک نظر اس آیہ کے لفظ هُوَ الَّذِي پر ڈال لیجئے جو دو لفظوں میں تمام براہین و دلائل کو اپنے آپ میں سمیٹے ہوئے ہے۔

۱؎ بداہتاً۔ بطور بداہت۔ فی البدیہہ بات کہنا (۲) بغیر سوچی ہوئی بات جو محتاج دلیل نہ ہو، کسی بات کا اچانک ظہور (۳) صریحی ہونا، یقینی، (۴) ارتجالاً یعنی بے سوچے بولنا ۲؎ "بوریا بننے والا بھی اگرچہ بننے والا ہے، لیکن اسے ریشم کے کارخانے میں تو نہیں لے جایا جاتا۔"

۳؎ حدت۔ تیزی، تندی (۲) طبیعت کی تیزی (۳) جوش، زور ۴؎ تناسخ۔ آواگون۔ ایک صورت سے دوسری صورت میں جانا، ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق روح کا ایک قالب سے نکل کر دوسرے قالب میں آنا۔ (۲) روح کا قالب بدلنا (۳) زمانہ بدلنا، زمانہ کا نوبت بنوبت گردش کرنا

۵؎ حلول۔ داخل ہونا، حلنا (۲) ایک شے کا دوسری میں اس طرح داخل ہو جانا کہ دونوں میں تمیز نہ ہو سکے۔ (۳) آواگون، تناسخ (۴) سمائی، اتر جانا ۶؎ اذعان۔ یقین کرنا، بھروسا کرنا، اعتبار کرنا (۲) اقرار کرنا (۳) اطاعت، حکم ماننا، فرمانبرداری کرنا ۷؎ لمعات (لمعہ/لمع کی جمع) روشنی، چمک، چمکارا، نور (۲) کرن، شعاع ۸؎ (سعدی/گلستان) چمگادڑ کی سی آنکھوں والے کو اگر دن میں کچھ دکھائی نہ دے تو سورج کے چشمے کا کیا قصور۔

۹؎ کشف الخفاء، رقم الحدیث ۲۱۵۷۔ دار الکتب العلمیہ، جلد ۲، ص ۱۵۶/ المقاصد الحسنہ: رقم الحدیث ۹۲۶ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ص ۴۲۰

اس ضمیر (ہُوَ) سے کیا آپ کے دل کو روشن اور اس اسم موصول (اَلَّذِیْ) نے کس طرح آپ کو واصل اس مقام کا کردیا جہاں تک پہونچنے کی تمنا عقلائے دہر کو فنا ہوجانے کے بعد بھی باقی رہی ؎

دل نگہدار از خیالِ غیرِ دوست
روز و شب از بہرِ او کن آہ و ہو [1]

اس سے زائد میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مضامین بہت ہیں اور دل میں بہت کچھ کہنے کی آرزو ہی مگر کیا کیجئے افسوس ؎

مرے دردِ دل کے ترانے بہت ہیں
شبِ وصل کم ہی فسانے بہت ہیں

مسئلہ رسالت اب بیانِ رسالت کا شروع ہوتا ہی۔ چھ سات لفظوں میں مسئلہ رسالت کا براہین و استدلال کے ساتھ بیان کردینا تو خدا ہی کا کام ہی۔ میں اسقدر جامع ترجمہ کرنے سے مجبور ہوں۔ نہ تو اردو زبان میں اس طرح کثیر معنی کو سمیٹنے والے الفاظ ہیں اور نہ مجھے ایسی قدرت حاصل ہی پس لامحالہ اس کے ترجمہ و تفسیر سمجھانے میں مجھے آپ کے وقت کا ایک کافی حصہ لینا ہوگا۔ اور امید کرتا ہوں کہ اخیر میں آپ بھی اپنی اس عطا سے ناراض نہ ہونگے۔

مسئلہ رسالت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنیکے لیے پہلے اس مقدمہ کو سمجھیئے کہ اجل ترین [2] موجودات بالاتفاق بنی آدم ہی لیکن ایک عجیب لطف ہی کہ آدم کی اولاد جب کتم عدم سے حیز وجود میں آتی ہی تو ہر طرح کے وہ سامان لوازم جو حیات کے لیے یا اپنے ماسوا سے بہرہ مند ہونیکے لیے اسے چاہئیں ان میں سے ایک بھی اسکے پاس نہیں ہوتا۔ ہر شے کے حصول کے لیے اسے ایک زمانہ اور مدۃ معینہ چاہیئے اور پھر یہ کہ قدم قدم پر ایک معلم کی تعلیم اسکی دستگیر ہو۔ برخلاف اسکے دیگر حیوان جو ہیج ان کے جسم میں مشارک [3] ہیں۔ وہ اپنے وجود کیساتھ تمام وہ سامان جو انھیں حر [4] و برد [5] سے محفوظ رکھے دشمن کے حملے سے بچا سکے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اپنی غذا کی تمیز انھیں پیدائش کیساتھ ہی ساتھ ہوتی ہی۔ ہر حیوان کو تم دیکھوگے کہ وہ اپنی غذا کو پہچانتا ہی۔ اپنے دشمن کو شناخت کرتا ہی۔ اپنے پر یا سرعت قدم کی مدد سے دشمن کی زد سے بھاگ سکتا ہی۔ یا پنجہ و دندان سے اپنی انسے مدافعت کرسکتا ہی۔ غرض حیوان کو جو کچھ بھی ہونا ہی وہ سب یکبارگی ہوجاتا ہی۔ اور چونکہ اسکی تمام تر ترقی صرف اس میں منحصر کہ وہ اپنی نوع کو قائم و باقی رکھے اس لیے اسے صرف خزانہ الٰہیہ سے اسقدر چیزیں جو دیکھتا ہی ساتھ عطا کردیجاتی ہیں جنکا ہونا تحفظ وجود و بقائے نوع کے لیے ضروری تھا۔ مگر انسان جو اپنی پیدائش کیوقت سادہ محض ہوتا ہی اسکے وجود کا مقصد صرف یہی نہیں ہی کہ وہ اپنے آپ یا اپنی نوع کو قائم و باقی رکھے بلکہ اسکی سطح اس سے کہیں بلند تر بنائی گئی ہی اسلیے وہ اس عالم میں ایک تدریج آہستہ آہستہ

---

[1] "محبوب کے غیر کے خیال سے دل کو محفوظ رکھو، شب و روز محبوب کے لیے گریہ و زاری کرتے رہو۔"
[2] اجل ترین موجودات۔ مخلوقات / کائنات میں بزرگ ترین یا نہایت بڑی شان والا [3] مشارک۔ شریک ہونے والا، ساجھی
[4] حَر۔ گرم ہونا (۲) گرمی [5] بَرد۔ سرما، سردی (۲) جاڑے کا موسم (۳) سرد

ایک ایک چیز کا عالم ہوتا جاتا ہی اور یہی ترقی کی رفتار پہلے سے لیکر تا لحد جاری رکھتا ہی جس انسان نے اپنے خلق کے اس راز کو سمجھا وہی تو حقیقتاً انسان رہا ورنہ اُس کا وجود صورتاً انسان اور حقیقتاً حیوان سے بدتر ہی اس مسئلہ کا کافی بیان تقریر آئندہ کے کسی حصہ میں آئیگا۔ اس وقت مجھے صرف مسئلہ تعلیم کی طرف آپ کو متوجہ کرنا ہی تاکہ صرف ضرورت مسالت اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

احتیاج معلم

انسان میں پانچ حواس ظاہری (لامسہ۔ باصرہ۔ سامعہ۔ ذائقہ۔ شامّہ) اور پانچ حواس باطنی (حس مشترک۔ وہم۔ خیال۔ حافظہ۔ متصرفہ) ودیعت رکھے گئے ہیں اور یہ حواس عشرہ کم و بیش سب میں پائے جاتے ہیں ہر حواس کا کام علیحدہ ہی اور ہر ایک کا ان میں سے ادراک جداگانہ۔ ایک حواس اگر ضائع ہو جائے تو دوسرا اُس کا قائم مقام ہو کر اسکے کام کو انجام نہیں دے سکتا سب سے پہلے انسان میں حس لامسہ پیدا ہوتی ہی۔ جب یہ حواس کام کرنا شروع کر دیتا ہی تو انسان کو اُس عالم کا علم ہونا شروع ہو جاتا ہی جس کا تعلق حس لامسہ سے ہی۔ اس کے بعد حس باصرہ پیدا ہوتی ہی اور اب ایک دوسرے عالم کا علم جو پہلے سے بہت زائد وسیع و دلفریب ہی اُس کے معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ پھر حس سامعہ آپ میں پیدا ہو کر نغمات و اصوات کا عالم لے بناتی ہی۔ اُس کے بعد حس ذائقہ اس کے بعد حس شامہ۔ الغرض پانچ حواس آہستہ آہستہ یکے بعد دیگر انسان میں پیدا ہو کر اُسے پانچ عالموں کا عالم بنا دیتی ہیں۔ اب جب کہ وہ تقریباً سات برس کا ہوتا ہی تو اُس میں ایک دوسرا حاسہ پیدا ہوتا ہی جسے تمیز کہتے ہیں۔ اور اب اس قوت تمیز سے وہ اُن اشیا کا علم حاصل کرتا ہی جس کے بتلانے سے حواس بالکل عاجز تھے اس کے بعد ایک اور نیا حاسہ اُس میں پیدا ہو کر اُسے ایک اور ہی عالم میں پہنچاتا ہی اور اس کا نام عقل ہی۔

اب اس تمام مدت میں اگر انسان کو کوئی شفیق و لائق معلم مل جائے اور علوم مفیدہ کا اُسے افاضہ کرے تو وہ ان نعمائے الٰہیہ کو (جو حواس و تمیز و عقل کی صورت میں اُسے عطا کی گئی ہیں) ان کو ایسا کام میں لاتا ہی کہ خلقت انسانی کے بعض مقاصد ایک حد تک پورے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی استاد نہ ملا اور اسکی تعلیم صحیح اصول پر نہوئی تو تمام نعمتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اور ایک حیوانی زندگی اُس کی رہ جاتی ہی ایک بدیہی بات ہی۔ اور مشاہدات اس پر شاہد عادل کہ انسان اپنے تمام لوازمات زندگی و معاشرت میں کسی معلم کا محتاج ہی اور یہ کہ اچھی معاشرت و متمدن زندگی تعلیم ہی کا نتیجہ ہی۔ جنھیں تعلیم نصیب نہیں ہوئی، اُن کی زندگی پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر دیکھنی چاہیئے۔ نہ مکان ہی نہ لباس۔ نہ کھانے کا طریقہ نہ رزق حاصل کرنیکے اصول

۱؎ حاسہ۔ محسوس/ادراک کرنے والی قوت، حس کرنے والی جیسے قوت سامعہ، باصرہ ۲؎ افاضہ۔ فیض (۲) فیض رسانی (۳) خبر پہنچانا، بہت کرنا، بات شروع کرنا ۳؎ نعما۔ نعمتیں، نعمت ۴؎ متمدن۔ مہذب (۲) بسنے والا

انھیں معلوم ہیں۔ غرضکہ جسقدر انسان میں دائرہ تعلیم و تعلّم کا وسیع ہوگا اُسی قدر وہ اپنے تمام حواس سے اُمد مفید کام لے سکیگا۔ لیکن انسان کی ترقی اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی بہنوز ایک بڑا حصہ اُس کی زندگی کا ناتمام ہے اور اُس حصہ کے تکملے کے لیے نہ حواس عشرہ کام دیتے ہیں۔ نہ قوت تمیز فائدہ پہنچاتی ہے نہ عقل ہی پوری رہبری کرتی ہے۔ مولنٰا روم اُن جذبات کو بیدار کرنے کے لیے اس طرح اشارہ فرماتے ہیں۔ ~~

پنج حِسّے ہست جز ایں پنج حِس + آں چو زرِ سرخ وایں حِسہا چو مِس

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک + نقشہا بینی بروں از آب و خاک [۱]

حاسہ رسالت و نبوت

یہ حصۂ زندگانی انسان کا وہ عظیم الشان حصہ ہے کہ بدون اُس کے تمام تعلیم و تعلّم اور ہر شعبۂ زندگی کا ترقی پذیر ہونا عبث ولا سود ہے۔ اس حصہ کا تکملہ اس طرح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی ایک کو منتخب فرماتا ہے اور اُسے ایک ایسا حاسہ عطا فرماتا ہے جس کے سامنے تمام حواس سابقہ دست طلب پھیلائے معاونت کے خواستگار ہیں۔ وہ حاسہ ان سب کے اغلاط کو پہچانتا ہے خطاکاریوں کو جانتا ہے ان کے مواقع زلات [۲] سے آگاہ ہوتا ہے۔ جہاں کہیں یہ مغالطہ [۳] میں پڑ جاتے ہیں یا تھک کر رہ جاتے ہیں تو وہ شخص (جسے منجانب اللہ وہ حاسہ عطا ہوا ہے) انھیں مغالطات سے آگاہ کرتا ہے اور اُن کے تاریک رستوں میں ایک شمع رکھتا ہے۔ منزل کو اُن پر آسان اور مطلوب کو اُن سے قریب کر دیتا ہے۔ اس حاسہ کا نام نبوت و رسالت ہے۔ اور اُس شخص کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اُس کو نبوت و رسالت عطا فرماتا ہے تو پھر وہ ان چیزوں کو دیکھتا ہے جس کو ہماری آنکھیں کسی طرح نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ وہ باتیں سنتا ہے جن کو سننے سے ہمارے کان عاجز ہیں۔ وہ مضامین سمجھتا ہے جس کے تعقل [۴] سے ہماری عقول بے بہرہ ہیں وہ اعلیٰ علوم اپنی نسبتِ فوقانی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے سیکھتا ہے۔ اور خلق کو پھر وہ باتیں بتاتا ہے اور ایسی راہ صراطِ مستقیم کی دکھلاتا ہے کہ جس بات کے سمجھنے سے، اور جس راہ کے پانے سے انسان بدون اس کی رہنمائی و رہبری کے مجبور و درماندہ ہے۔ ہاں نورِ نبوت سے اگر انسان اپنی اُن مخفی قوتوں کو جس کی طرف مولنٰا روم نے اشارہ فرمایا ہے اور جسے صوفیہ لطائف کہتے ہیں مستنیر [۵] بناتا ہے تو پھر وہ بھی عوام کی سطح سے اُسی قدر بلند ہو جاتا ہے جس قدر بصیر نابینا سے ارفع ہے۔ اس کا انکار بجز جاہل و متعصب کے کوئی کر نہیں سکتا۔ لہٰذا اب ہم دوسرے پہلو سے اس بحث کو صاف کرتے ہیں۔

ایک کامل دستور العمل کا معیار * انسان کی طبیعت تمدن [۶] کی مقتضی ہے۔ اور چونکہ تمدن اقتضائے طبیعت سے

۱ ''ان حواس خمسہ کے علاوہ پانچ حواس اور ہیں وہ سونے کی طرح سنہری اور یہ چاندی کی طرح۔ دل کا آئینہ جب صاف اور پاک ہو جاتا ہے تو اس میں آب و خاک سے پرے (ورائے آب و خاک) کے نقوش نظر آتے ہیں۔'' ۲ زلات (زل یا زلہ کی جمع) لغزشیں (۲) غلطیاں، خطائیں (۳) پھسلنا، لڑکھڑانا ۳ مغالطہ (جمع مغالطات) دغا، فریب، دھوکا، جھانسا، دَم، مکر (۲) کسی کو غلطی میں ڈالنا، آپس میں غلطی لگ جانا ۴ تعقل۔ کسی کام میں فکر کرنا، بات پر غور کرنا، سوچنا، سمجھنا (۲) خبر دینا، اطلاع دینا ۵ مستنیر۔ نور تلاش کرنے والا، روشنی کی طلب کرنے والا (۲) روشن ۶ تمدن۔ طرز معاشرت، مل کے رہنے کا طریقہ (۲) شہریت ہونا، شہر میں رہنا سہنا اختیار کرنا (۳) شہر کا انتظام کرنا

اِس لیے ہر وہ اُصول جس کا تعلق تمدّن سے ہو اور تمام وہ علوم جو تمدّن کو بارونق بنانے والے ہیں انسان بالطبع ان کی طرف راغب و مائل ہوتا ہے۔ اور اسی تمدّن کے اقتضائے طبعی ہونے سے علم انسان کے لیے ضروری ہوگیا۔ اب یہاں پر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ تمدّن زندگی ایک زبردست و کامل دستور العمل چاہتی ہے تاکہ معاملات باہمی میں ایک دوسرے کے حقوق کی محافظت رہے۔ ایک کی صنعت و حرفت و کمال سے دوسرا بغیر اس کے کہ جانبین میں سے کسی پر زیادتی ہو آپس میں متمتع ہوتے رہیں۔ انسانی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے جذبات کو اعتدال پر قائم نہیں رکھ سکتا۔ اور حق تو یوں ہے کہ جذبات پر قوت حاصل کرنا اور نہیں افراط و تفریط سے بچائے رکھنا نہایت ہی دشوار ہے۔ انسان کا اُس حال میں جب کہ نفس کا سخت حملہ ہوتا ہے عدل و انصاف پر قائم رہنا بہت ہی اہم و معرکتہ الآرا ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ اُسے یہ معلوم ہو کہ مواخذہ کی نگاہ اُسے دیکھ نہیں رہی ہے۔ پس اب جو دستور العمل کہ حیاتِ انسانی کے لیے مقرر کیا جائے اُن میں حسب ذیل باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ (اوّلاً) اُس کے دستور اور قواعد ایسے ہوں جو ہر طبقاتِ انسان کے طبائع کے مطالعہ کے بعد بنے ہوں تاکہ ہر زمانے میں ہر مقام میں ہر اقوام میں وہ دستور العمل یکساں فائدہ پہنچائے (ثانیاً) وہ قواعد ایسے ہوں کہ جن پر عمل کرنا ممکن ہو اور اُس پر عمل کا لازمی نتیجہ فلاح و بہبود ہو (ثالثاً) یہ کہ اُس دستور العمل کی واضع وہ ذات ہو جس کی نسبت تمام آدمیوں سے یکساں ہو تاکہ اُس میں کسی جماعت کی رعایت کی قرابت یا ہموطن یا ہم قوم ہونے کے سبب سے نہ کی گئی ہو۔ (رابعاً) یہ کہ واضع قانون کا علم اس قدر وسیع ہو کہ اُسے عمل کرنے والوں کے حال سے ہر آن خبر رہتی ہو۔ (خامساً) یہ کہ اُس کا دائرہ حکومت اس قدر وسیع ہو کہ جس سے نکل کر بھاگ جانا محال ہو (سادساً) اُس میں سزا و جزا کی قدرت تامہ ہو (سابعاً) سہو و نسیان کو قصد و ارادہ سے جُدا کر سکتا ہو (ثامناً) اطاعت و عدم اطاعت کا اثر اُس کی ذات یا اُس کی سلطنت پر نہ پڑتا ہو (تاسعاً) کوئی دوسرا اُس کا کسی امر جزئی میں بھی شریک نہ ہو۔ الحاصل حیاتِ انسانی کے لیے کامل دستور العمل تو وہی ہو سکتا ہے جس کا بنانے والا ان کمالات سے متصف ہو۔ اور خود وہ دستور العمل اپنی ذات سے اس طرح جامع و سہل العمل ہو۔ اب تم خود غور کر لو کہ کیا دستور العمل بنانا کیا امکان بشری میں ہے کیا کوئی سلطنت سرّاً و علانیۃً یہاں تک کہ افعال قلوب پر بجز علم الٰہی کے محیط ہے؟ کیا کوئی طاقت عالم مبدء[1] عالم برزخ[2] عالم معاد[3] تک سوائے قدرتِ خداوندی کے چھائی ہوئی ہے کیا دنیا میں کوئی قوت ایسی ہے جس کا مقابلہ محال ہو۔ پس اسی لیے اس جلّ مجدہ نے جس نے انسان کو پیدا کیا

[1] مُبدء۔ شروع کرنے/ہونے کی جگہ، ظاہر ہونے کی جگہ (۲) شروع، آغاز (۳) بنیاد، اصل (۴) آغاز کرنے والا، پیدا کرنے والا۔
[2] عالم برزخ۔ موت اور قیامت کے درمیانی عرصہ کے لیے روحوں کے رہنے کا مقام [3] معاد۔ لوٹ کر جانے کی جگہ، واپس جانے کا مقام، جائے بازگشت (۲) (مجازاً) عقبیٰ، آخرت، حشر، قیامت، عاقبت

اُس میں جذبات عطا کیے اس کی طبیعت میں تمدن کا اقتضا خلق فرمایا۔ اسی نے اُن کے لیے ایک کامل دستور العمل اپنے رسول کی معرفت بھیجا جس کو اصطلاحِ شریعت میں وحی کتاب اللہ کہتے ہیں۔ اس کتاب مقدس میں اصلاحِ معاش وفلاحِ معاد کے اصول بتا دیے۔ نیز اوامر پر عمل کرنیوالوں کو مژدۂ فضل و رنواہی پر جسارت کرنیوالوں کو اپنے عقاب[1] کی تہدید[2] بھی سنا دی۔ اس سے بھی آگاہ فرما دیا کہ سرکشوں کو جو چند روز تک مہلت دیکر تمتعات[3] دُنیا کا حظ[4] وافر دیا جاتا ہے اس سے دھوکا نہ کھانا۔ وہ عذاب الٰہی کا پیش خیمہ و دیباچہ ہے۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ[5] (جب اُن باتوں کو جو یاد دلائی گئی تھیں بھلا دیتے ہیں تو ہم ہر چیز کی کامیابی کے دروازے اُن پر کھول دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ ان کامیابیوں پر خوش ہونے لگتے ہیں تو ناگہاں ہم ان کو اس طرح انھیں پکڑ لیتے ہیں کہ بے آس ہو کر رہ جاتے ہیں۔)

جن قوموں نے نافرمانی اپنا تمغۂ افتخار بنا رکھا تھا۔ اُن کے عبرت ناک واقعات بیان کر کے اچھی طرح ظاہر فرما دیا کہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا[6]۔ علامہ ابن خلدون[7] نے انھی قرآنی قصص سے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ اللہ تعالیٰ جب کبھی کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اُس سے کسی خاص نتیجہ کی طرف توجہ دلانی مقصود ہوتی ہے یعنی ع سنو احوال اگلوں کا سبق لو اور کرو عبرت۔

حقیقی حیات اور حقیقی علم

خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں اس کی حاجت تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک مکمل دستور العمل[8] ہمارے پاس بھیجے۔ تاکہ اُسے ہم اپنا دلیل راہ ہدایت بنائیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنا کلام اپنے حبیب کی معرفت ہم تک بھیجا۔ اور اس کلام ربانی کا نازل ہونا تھا کہ دنیا میں ہل چل مچ گئی۔ اور ایک انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہوا۔ اب جو دُنیا بن سنور کر نکھری تو یہ وہ دنیا ہی نہ تھی۔ مگر افسوس ہے دنیا پر کہ اُس کا چہرہ پھر بدنما دھبوں سے داغدار ہوتا جاتا ہے۔ اُس دستور العمل[8] سے معاصی[9] ہمیں بہت کچھ دور ہٹا کر لے آئے ہیں ؎

سنبھلنے دے ذرا اے ناتوانی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

حضرات! یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اور خوب یاد رکھئے کہ پوری متمدن زندگی اور صحیح و سچی حیاتِ انسانی جبھی حاصل ہوگی جب کہ بارگاہ نبوت سے تعلیم حاصل کی جائے۔ اور اس قدر علم کا حصہ

---

[1] عقاب۔ عذاب دینا، دکھ، تکلیف [2] تہدید۔ تنبیہ، سرزنش، گھرکی، ڈرانا، خوف دلانا، دھمکی (۲) دھمکانا [3] تمتعات (تمتع کی جمع) فائدہ اٹھانا یا حاصل کرنا (۲) استعمال کرنا (۳) پھل پانا (۴) نفع، فائدہ، بہرہ (۵) لذت، فرحت، خوشی [4] حظ۔ حصہ، بخرہ، بہرہ، قسمت، نصیب (۲) خوشی وخرمی، انبساط (۳) ذائقہ، لذت [5] الانعام: ۴۴
[6] "آپ اللہ کے دستور کے لیے ہرگز کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔" (الفتح: ۲۳، الاحزاب: ۶۲ و فاطر: ۴۳)
[7] علامہ عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) [8] دستور العمل۔ قاعدہ، قانون، ہدایت نامہ [9] معاصی (معصیت کی جمع) نافرمانیاں، گناہ، پاپ، قصور، خطائیں۔

جس کی تعلیم مختص انبیا علیہم السلام کے ساتھ ہے اور جس تعلیم کے لیے اُن کی بعثت ہوتی ہے۔ اگر نہ حاصل کیا جاوے تو اگرچہ دیگر علوم و فنون سے آپ لا مال ہی کیوں نہ ہو جائیں مگر حقیقت میں آپ مفلس[1] ہی رہینگے۔ گو ظاہر میں آپ کی حیات انسانی معلوم ہوگی مگر حقیقت میں یہ اُس کا ڈھانچ[2] و قالب بیجان ہوگا جو واقعہ میں بیکار و لاسود محض ہے۔ جس طرح جسم بلا روح مُردہ ہے اسی طرح تمام علوم بغیر تعلیم رسالت مردہ ہیں۔ ہمارے تمام علوم مدونہ[3] ہمارے کسب کے نتائج ہیں۔ اس لیے اُن میں خطاؤں کا نہ صرف احتمال بلکہ وقوع ہوا کرتا ہے۔ پھر ہمارے علوم میں یہ قوت کہاں کہ جس سے روح کا تغذیہ[4] ہو۔ برخلاف اس کے پیغمبر کے علوم وحی الٰہی ہوتے ہیں عصمت اُس کی ذاتی صفت ہوتی ہے۔ اُس کے علم میں نفس کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اُس کا علم اغلاط سے پاک اور نقص سے مُبرا ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ سراپا رُشد و ہدایت ہوتا ہے۔ اسی امر کی طرف اس آیۂ کریمہ میں اشارہ ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا[5]۔ بعد اس کے کہ اس قدر بحث آپ رسالت کے متعلق سُن چکے اس بات کی طرف ذرا توجہ فرمایئے کہ وہ کونسی رہنمائی و ہدایت تھی جسے لیکر ہمارے پیغمبر روحی فداہ تشریف لائے۔ تاکہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اچھی طرح آپ سمجھ جائیں۔ اس کے لیے مختصر جملوں میں پہلے عرب کی حالت، ایام جاہلیت کی سننا چاہیئے۔ اُس وقت اس ہدایت کے غلبہ و عظمت کا حال معلوم ہوگا۔

حالتِ عرب قبل بعثت اور اُس کا علاج

بعثت کے وقت عربوں کی حالت علمی یہ تھی کہ کل چھ یا سات آدمی مکہ میں ایسے تھے جو اسقدر لکھنا پڑھنا جانتے تھے جس سے کاروبار تجارت اُن کا چلتا رہے۔ اس لیے کہ نوشت و خواند اُن کے خیال میں شیوہ اراذل[6] تھا جنہیں نہ غیرت ہو نہ شجاعت۔ تمدن و معاشرت کی اُن کے یہ حالت تھی کہ چمڑے کے خیمے اُن کے مکانات تھے۔ بکریوں اور اونٹ کے گلے اُن کی معیشت۔ جہاں سبزہ اور پانی دیکھا وہیں خیمہ نصب کر دیا ایک موسم میں یہاں ہیں تو دوسرے موسم میں وہاں۔ سلطنت کی اُن میں یہ حالت تھی کہ نہ کوئی اُن کا باضابطہ بادشاہ تھا اور نہ اُن پر حکومت کرنے کے لیے کوئی قانون۔ قبائل کے شیوخ سردار ہوتے۔ کبھی کسی کی اگر جمعیت زیادہ ہوگئی اور دل خوش کن لقب سلطان کا اُس نے قوم سے حاصل کر لیا تو چند روز میں کسی معمولی بات پر کوئی قبیلہ اُس سے الجھکر اُس کا اور اُس کے خاندان کا اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُس لقب و خطاب کا خاتمہ کر دیتا۔ قصائد و اشعار جاہلیت سے ان تمام باتوں کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ اب ایسے حال میں جب کہ قوم میں

[1] مفلس۔ محتاج، غریب، نادار جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ مفلوک، بے زر [2] ڈھانچ۔ خاکہ، قالب، ڈول، بے بُنے پلنگ، چارپائی، کرسی وغیرہ کا چوکھٹا [3] مدونہ۔ جمع کیا ہوا/ کیا گیا، ترتیب دیا گیا [4] تغذیہ۔ غذا/ خوراک دینا، پالنا (۲) غذا، خورش

[5] "اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین عطا فرما کر بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کر دے اور اللہ کافی گواہ ہے۔" (الفتح:۲۸)

[6] اراذل (ارذل کی جمع) بڑے رذیل، کمینے لوگ، نالائق، ہیچ، کم ذات، اوچھے

نہ سلطنت ہے نہ تمدن نہ علم نہ امن نہ اتفاق، رسول مبعوث ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو ہر حال سے پست اور ہر پہلو سے ضعیف پاتا ہے۔ اُس کے گرد و پیش قیصر و کسرا کی سلطنتیں جہانداری و جہانبانی کا پھریرا اُڑا رہی ہیں۔ ایران کی نفاست پسندی اپنے معاشرتی ناز و کرشمے کی بہاریں دکھلا رہی ہے۔ یونان و اسکندریہ کا بحرِ فلسفہ موجیں مار رہا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پیغمبر قوم کو ان سب میں سے کس شئے کی طرف بلاتا ہے۔ ایک ایسی قوم جو تمام کمالاتِ انسانی سے خالی و عاری ہو گئی ہو اور دوسری مقابل قومیں بعض کمالات اپنے آپ میں رکھتی ہوں رسول نے اُس وقت میں اپنی قوم کو کیا رہنمائی کی۔ آیا اُن سے یہ کہا کہ اے قوم اُٹھ تلوار و نیزوں کو سنبھال اور تو بھی ایک ملک گیر و جہاندار کی حیثیت مثل قیصر و کسریٰ کے اپنے میں پیدا کر۔ یا یہ کہا کہ اے قوم پتھر دیکھے بھنے گوشت اور اونٹوں کے کوہان کا کباب کب تک یہ چمڑے کے خیمے میں رہنا کہاں تک بیدار ہو اور کم از کم ایران جیسی معاشرت تو اختیار کر۔ یا یہ کہا اے اہلِ عرب یہ جہالت سے اُنس اور علوم و فنون سے وحشت تا بکے ہمت کرو اور رشکِ اسکندریہ و یونان مکہ کی وادیوں کو بنا دو۔

دیکھئے قوم سراسر مریض ہے بیماریوں نے کوئی حصہ جسم کا چھوڑ نہیں رکھا ہے۔ اب اس وقت علاج کونسے مرض کا کیا جائے جس سے تمام بیماریاں خود بخود زائل ہو جائیں۔ آیا اُسے جہالت کے مرض سے علوم عقلیہ پڑھ کر شفا ہو۔ یا تمدن کی مفرحات[1] دی جائیں یا سلطنت کا جواہر مہرہ[2] اُسے استعمال کرایا جائے۔ غرض یہ کہ کیا کیا جائے جس سے یہ مریض نہ صرف صحیح و تندرست ہو جائے بلکہ دوسرے مریضوں کے لیے اُس کا وجود اکسیر[3] اعظم بنجائے۔ تو اس کا صحیح جواب و سچا جواب وہی پہلی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی جو سب سے پہلے آپ نے اپنی قوم کو فرمائی۔ وہی حقیقی علاج تھا اُس قوم مریض کا اور وہی سچی شاہ راہ تھی ترقی کی اور وہی کلید تھی خزائنِ تمدن کی۔ کیا تم سے وہ اولین تعلیم مخفی و مجہول[4] ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کہہ اُٹھو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ یہی تھا سارا مرض قوم کا علاج کہ اَيُّهَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ[5] جب قوم نے اپنا رشتہ خدا سے درست کر لیا تو پھر وہ تمام تعلقات جن کا علاقہ مخلوق یا کائنات کے ساتھ تھا خود بخود سلجھ گئے اللہ سے بُعد ایسا بدبخت مرض ہے کہ جس کے سبب سے انسان تمام بدنصیبیوں کا آماج گاہ[6] بنجاتا ہے۔ اور جب اس کا علاج کیا جاتا ہو تو اس بیماری کی دوا نفس کو تمام دواؤں سے زائد کڑوی و کسیلی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس لیے نفسِ امارہ اس سے سخت ابا کرتا ہے۔ اس وقت میں بھی تم دیکھو گے کہ انسان کو علوم مدونہ حاصل کرنا آسان ہے معیشت کا سامان فراہم کرنا بھی سہل ہے۔ ان چیزوں کے حاصل کرنے کا خود بھی

[1] مفرحات۔ وہ دوائیں، جن سے طبیعت کو فرحت اور خوشی حاصل ہو۔ [2] جواہرِ مُہرہ۔ اہلِ فرنگ چند دواؤں سے ترکیب دے کر بہت سے رنگوں کی ایک گولی بناتے ہیں، جس میں تریاق کی خاصیت ہوتی ہے۔ [3] اکسیر۔ کیمیا (۲) کسی بیماری کے لیے جلد اثر کرنے والی اور بے حد مفید دوا [4] مجہول۔ غیر معلوم، گمنام، نامعلوم (۲) انجان، نادانستہ شدہ (۳) وہ فعل، جس کا فاعل معلوم نہ ہو۔ [5] الصحیح المسلم، جلد اول، کتاب الایمان۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی، طبع ثانی، ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء، ص ۳۷ [6] آماج گاہ۔ نشانے کی جگہ، نشانہ لگانے کا مقام

ولولہ ہوتا ہی اور دوسروں کو بھی جوش میں لا سکتے ہیں۔ لیکن خدا کا خوف دل میں پیدا کرنا اور اُس کو حاضر و ناظر جانکر اپنے معاملات و اخلاق کو درست کرنا نہایت ہی کمیاب بلکہ نایاب ہی۔ پس رسول نے اصلی مرض کی تشخیص کی اور اس سے صحت یاب ہونے کے لیے ایک قدح[1] توحید کا تیار کیا۔ قوم کڑوی و تلخ دوا دیکھکر بہت کچھ مچلی[2] منہ موڑا ہاتھ پاؤں پھینکے لیکن پیغمبر نے اللہ شانہٗ، اللہ کافی کہکر وہ پیالہ منہ سے قوم کے لگا ہی دیا۔ اب کیا تھا ؎

مست می بیدار گردد نیم شب

مست ساقی روز محشر بامداد[3]

دوا کا حلق سے اُترنا تھا کہ صحت کے آثار نمودار ہوئے ہر طرف سے رحمت کے دروازے کھل پڑے۔ علوم و فنون کی باگ بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں آگئی اور سریر[4] سلطنت پر بھی قبضہ ہوگیا۔

فتوحات اسلامیہ اور علوم مدونہ عربیہ اس وقت تک اُن پاکبازوں کے کمالات و جاہ جلال کا نہایت بلند آہنگی سے اظہار کر رہی ہیں۔ وہ دنیا سے چل بسے لیکن اُن کی مہربانیاں آن سے آیندہ آنیوالی نسلوں کے لیے ہمیشہ شکریہ ادا کراتی رہینگی ؎

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما[5]

اسلاف اور اخلاق

تم دیکھو گے کہ جب تک مسلمانوں نے اطاعت الٰہی کو اپنا شعار[6] رکھا اور سرًا و علانیۃً خدا کے بھیجے ہوئے دستور العمل کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا نمونہ اُن کے پیش نظر رہا اُس وقت تک اُن کی ترقی برق رفتار رہی آج جس چیز کی بازار مسلمین میں کساد بازاری[7] ہی قرون اولیٰ میں اُس کی ایسی فراوانی تھی کہ اپنے تو خیر اپنے ہی تھے بیگانوں تک کے گھروں کی رونق انہی مسلمانوں کے عملیات کا نتیجہ تھا۔ دیکھیے آج یہ رونا ہے کہ مسلمان تمام اقوام سے تعلیم میں پیچھے ہیں اور اس قدر موخر اور اس قدر بطی السیر[8] ہیں کہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اُس قوم کے جوان کے دوش بدوش[9] آباد ہی کب تک ہم سفر و ہم منزل ہونگے جبر جائے کہ اُن اقوام کے پہلو میں جگہ پانے کے قابل ہوں جو اس وقت سر بفلک ہیں۔ اور ذرا یہ دیکھو کہ مسلمان جب کہ سچ مچ مسلمان تھے تو کیا اسی طرح اُن علوم دنیاوی سے بے نصیب تھے۔ اس کے لیے زائد مطالعہ

[1] قدح۔ بڑا پیالہ (۲) ساغر، پیمانہ، جام (۳) بادیہ [2] مچلی (مچلانا) طبیعت کا قے پر مائل ہونا/ قے کرنے کو جی چاہنا، مالش کرنا، متلانا، ابکائی آنا [3] "شراب کا مست آدھی رات کو بیدار ہو جاتا ہے، ساقی کا مست روز محشر کی صبح کو۔" [4] سریر۔ بادشاہی ملک/ تخت، سنگھاسن [5] (حافظ) "جس کا دل عشق سے زندہ ہو، وہ کبھی نہیں مرتا۔ کائنات کے صحیفے پر ہماری ہمیشگی ثبت ہے۔" [6] شعار۔ طریقہ، دستور، عادت، طرز

[7] کساد بازاری۔ بازار میں خرید و فروخت نہ ہونا، بازار مندا ہونا، بکری کا نہ ہونا [8] بطی السیر۔ دھیرے دھیرے چلنے والا، جس کی رفتار سست ہو [9] دوش بدوش۔ کندھے سے کندھا ملا کر (۲) اتفاق سے

کی حاجت نہیں ایک سرسری نظر عہد مامون[1] الرشید پر ڈالو۔ خود ہی معلوم ہو جائیگا۔ حدود اسلامیہ کی ماسوا کے دور سلطنت میں وسعت کو خیال کرو۔ تمھیں ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملیگا۔ ایسے ایسے مدارس اعلیٰ و عظیم الشان تم پاؤگے جن میں ہر ایک اپنی ذات سے ایک یونیورسٹی کا حکم رکھتا ہوگا۔ بغداد کا چپہ چپہ تمھیں سائنس کا مرکز علوم ہوگا۔ اس عہد میں کتنے علوم ایجاد ہو چکے تھے اور کتنے فنون میں کتابیں تصنیف ہوئی تھیں۔ تاتاریوں کے حملے اور بغداد کی تباہی[2] کے بعد بھی اگر ان کی فہرست تیار کی جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب کی شکل میں مرتب ہو سکتی ہے۔ اس عہد میں علم کیمیا کے متعلق مسلمانوں نے تقطیر (عرق کھینچنا) تصعید (بخار منجمد کر کے اوڑانا) تکلیس (پگھلانا) ترویق (چھاننا) وغیرہ وغیرہ ایجاد کر لیا تھا۔ زمین کی پیمائش ہو چکی تھی۔ مناظر[3] و مرایا[4]۔ جر ثقیل[5] و توازن[6] مائعات[7] پر عجیب و دلکش تحقیقات ہوئی تھی۔ بغرض قطع نظر ان علوم کے جن کا تعلق براہ راست مذہب سے تھا یا جو مذہبی علوم کے خدام و وسائط[8] تھے تم ان علموں میں جنھیں عقلیہ کہا جاتا ہے مسلمانوں کا ایسا بلند منصب پاؤ گے کہ اس وقت تمھیں حیرت ہوگی کہ کیا یہ وہی قوم ہے جو کسی وقت تمام دنیا میں سب کی استاد تھی اور آج شاگردی کے قابل بھی نہ رہی۔ اس عہد کے عام مذاق کا اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ہر رئیس اپنے مکان کی زینت کتب خانہ کو اور اپنی مجلس کی رونق مذاکرہ علمیہ کو سمجھتا تھا۔ امرا کی جماعت عموماً نائو نوش و فضول و لایعنی باتوں میں اوقات صرف کیا کرتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں علم کی ہمہ گیری سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ علمی کتابوں کا ہونا دقیق مسائل پر مباحثہ قائم کرنا اور خود بحث میں محققانہ حصہ لینا لوازمات[9] امارت[10] سے تھا۔ گلی کوچوں میں سے بھی اگر کوئی گزر جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیتا ہے۔ یہی حال صنعت و حرفت و تجارت کا تھا۔ ہر شخص اپنا کسب کرتا اور اپنی روٹی اپنے دست و بازو سے حاصل کرتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت کہ "السّوال ذلّ" زمانگنا خواری ہے[11] ہر شخص کو یاد تھا۔ اور اس پر خلق اس شدت سے عمل تھی کہ اگر کسی کا کوڑا زمین پر گر جاتا تو سوار خود گھوڑے سے اتر کر اُسے اٹھاتا تھا۔ کسی دوسرے سے اٹھانے کو کہنا داخل سوال سمجھا جاتا تھا۔ مجھے اس پر ایک واقعہ عہد رسالت کا یاد آیا۔ ایک مفلس شخص دربار رسالت میں حاضر خور و نوش کے لیے سوال کرتا ہے۔ آپ اُس سے فرماتے ہیں کہ تیرے گھر میں کوئی سامان ہے جواب نفی میں ہوتا ہے۔ دوبارہ فرماتے ہیں کہ کچھ تو ہوگا۔ غور کر۔ غرض بہت فکر و خوض کے بعد اُس نے سوچ کر عرض کیا کہ ہاں ایک فرسودہ[12] پالان[13] رکھا ہوا ہے آپ نے فرمایا کہ اُسے لے آ۔ جب اُس نے سامنے لا کر حاضر کر دیا تو آپ نے اصحاب سے فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس محتاج کے کہنہ و فرسودہ پالان کو خرید ے۔ ایک صحابی نے

۵ جر ثقیل - بھاری بوجھ کو آسانی سے اٹھا لینے کا علم، جر ثقیل کا علم (۲) بھاری بوجھ ۶ توازن - دو اشیا کا باہم برابر اور ہم وزن ہونا (۲) برابر تول لینا (۳) تناسب ۷ مائعات (مائع کی جمع) بہنے والی چیزیں، پانی، تیل وغیرہ

۸ وسائط (واسطہ کی جمع) لگے واسطے، وسیلے، ذریعے، سبب ۹ لوازمات (لازمہ کی جمع) ضروریات ۱۰ آمارت - علامت، نشانی ۱۱ یہ الفاظ یہاں مجبوراً استعمال ہوئے ۔ ۱۲ فرسودہ - گھسا پٹا، پھٹا ہوا، بہت پرانا، بوسیدہ

۱۳ پالان - بارکش جانوروں کی ٹاٹ اور نمدے وغیرہ کی بار برداری کے گدے جو گھوڑے، اونٹ وغیرہ کی پشت پر اس کے بچاؤ کے لیے ڈالا جاتا ہے۔

۱ خلفاءِ عباسیہ کے ساتویں خلیفہ مامون الرشید بن ہارون الرشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) علومِ عقلی و نقلی میں تمام خلفاءِ بنو عباسیہ سے بڑھ کر تھا اور سخاوت و شجاعت میں مشہور نام ہے۔ اقلیدس کا ترجمہ اسی نے کرایا۔ ۲ ۱۲۵۸ء تا ۱۲۶۰ء ۳ مناظر (منظر کی جمع) تماشا گاہیں (۲) دیکھنے کے لائق مقامات، سین، نظارے ۴ مرایا (مراۃ کی جمع) خلاف قیاس، آئینے، منہ دیکھنے کے شیشے، برتن

دو درہم قیمت دیکر اُسے خرید لیا۔ آپ نے ایک درہم اُسے دیکر فرمایا کہ جا بازار سے ایک کلہاڑی خرید لا۔ جب وہ کلہاڑی لے آیا تو آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اس میں لکڑی کا ایک بینٹ[1] لگا دیا، اور اس سے کہا کہ ایک درہم جو بچا ہوا ہے وہ اپنی بی بی کو جا کر دیدے تاکہ آج کے کھانے کا وہ اس سے سامان کرے اور تو کلہاڑی لیکر جنگل جا، اور لکڑیاں لاکر بازار میں فروخت کر، اس طرح اپنی روزی اپنے قوت بازو سے پیدا کیا کر۔ خیال کرنا چاہیئے کہ اسلام نے کہاں تک ہمیں باغیرت اور کہاں تک کاروباری[2] بنانا چاہا تھا، مگر ہم نے اپنے آپ کو کیا بنا ڈالا۔ افسوس تباہی خود ہم اپنے اوپر لائیں اور اتہام[3] اسلام پر رکھیں۔

اب جب کہ مسلمان اپنے اُس دستورِ العمل سے، جو خدا نے اُن کے صلاحِ معاش و معاد[4] کے لیے بھیجا تھا، ہٹنے لگے تو سب خرابی آہستہ آہستہ اُن میں آنے لگی۔ زبردست زیردستوں پر ظلم کرتا، ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ نہ کرتا، اس سے فساد و نااتفاقی پیدا ہوئی، امنِ عامہ میں خلل واقع ہوا جس سے علم و صنعت کی سرد بازاری ہونی شروع ہو گئی۔ اسی طرح ایک ایک نصیحت پر عمل چھوٹتا گیا اور تُو تُو خرابیاں آتی گئیں۔ اب نہ علم ہے نہ تجارت، نہ صنعت ہے نہ زراعت، ہائے ہائے کیا کرو یا اسلاف کے کارنامہ پر مسکر فخر و مباہات[5] کرتے ہو، اس سے کیا ہوتا ہے۔

عزیزو! جس طرح کل گزشتہ کا کھانا آج کی بھوک کو دفع نہیں کر سکتا، اسی طرح گزشتہ اقبال کا تذکرہ آج ہمیں اقبال مند[6] نہیں بنا دے گا۔ جس طرح میت پر نوحہ کرنے سے اس کی مراجعت نہیں ہوتی اُسی طرح ہائے وائے کرنے سے وہ نعمتِ اسلامی واپس نہیں آتی ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدی وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن[7]

ہاں اس چیز کو پھر حاصل کرو جس کے طفیل میں سب کچھ آگیا تھا بغیر اس کے ترقی محال[8] ہے اور یہ استحالہ کا حکم میں نہیں دے رہا ہوں بلکہ قرآن کریم کا یہ فتویٰ ہے! اور وہ فتویٰ ہے جس کا مشاہدہ تم ہر روز ہر شخص میں کیا کرتے ہو۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ[9] اُن جذبات کو جو ہمارے نفوس میں ودیعت کیے گئے ہیں جب تک ہم صحیح راہ اعتدال پر نہ لائیں گے، ہرگز ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

---

[1] بینٹ۔ دستہ کلہاڑی وغیرہ میں لگی ہوئی لکڑی [2] کاروباری۔ کام کاج کا آدمی (۲) سوداگر، تاجر، تجارت پیشہ۔
[3] اتہام۔ بہتان، الزام، تہمت لگانا [4] صلاحِ معاش و معاد۔ آخرت/عقبیٰ اور جائے زندگی یعنی دنیا کی بہتری و بھلائی۔
[5] مباہات۔ شیخی، بڑائی، فخر/ناز کرنا (۲) شان و شوکت (۳) اترانا [6] اقبال مند۔ خوش قسمت، خوش نصیب (۲) دبدبہ والا۔
[7] (عرفی شیرازی) "اے عرفی! اگر گریہ و زاری سے وصال میسر ہو سکتا تو حصولِ مدعا کے لیے سو سال رونا بھی ممکن تھا۔"

[8] استحالہ۔ محال ہونا، ناممکن ہونا، دشوار ہو جانا (۲) طلبِ محال، دشوار پسندی [9] "خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا" (الرعد:۱۱)

اصولِ ترقی اور قرآنِ کریم

آؤ ہم اپنے ترقی کے اصول قرآنِ کریم سے دریافت کریں جو وہ بتائے اُسی راہ پر چلنے کی کوشش کریں اگر اس سعی کا نتیجہ اس قدر بھی ہو کہ ہم اپنی موجودہ حالت سے انحطاط[1] نہ کریں اور روز افزوں پستی سے نجات پا جائیں تو شاید اُس وقت آگے بڑھنا بھی آسان ہو جائیگا! اس وقت تو ہر لمحہ ہمیں فنا کے سیل میں بہائے لئے جا رہا ہے۔

گرے جاتے ہیں اپنے آپ نظروں سے ستم یہ ہے
بدل جاتے تو کچھ رہتے مٹے جاتے ہیں غم یہ ہے

قرآنِ کریم ہمیں یہ راز اس طرح بتلاتا ہے کہ اگر ہم اپنی اس نسبت کو جو ہمیں اپنے خالق سے ہونی چاہیئے اور اُس تصرف کو جو ہمیں کائنات پر اللہ کی جانب سے عطا ہوا ہے صحیح طور پر درست کرلیں تو پھر وہی ہم ہیں اور وہی اقبال۔ اس کے لئے (اولاً) ہمیں اپنی استعداد (ثانیاً) اپنا جائز تصرف معلوم ہونا چاہیئے۔ ان میں سے ہر ایک کو قرآن سے سنئے شاید اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق عطا فرمائے۔

کلام اللہ میں عزّ مجدہ نے ہماری استعداد سے اس طرح ہمیں آگاہ فرمایا ہے کہ اے انسان تیری ساخت سب سے بہتر میں نے بنائی ہے! اب اگر تو اپنے آپ کو خراب کریگا تو اس کا تو خود ذمہ دار ہے اور اگر میری بتلائی راہ پر زندگی بسر کریگا تو تیرے اجر کا سلسلہ غیر متناہی[2] ہوگا۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ[3]۝ اس سے یہ قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ اگر ایمان و عمل صالح ہے تو پھر اجر کا سلسلہ غیر متناہی ہے اور اگر یہ نہیں تو پھر خوبی و کمال کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنی اصل خلقت پر بھی قیام ناممکن ہے، اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ[4] ہی میں جا کر ٹھہرینگے۔ غرض ہم میں ایسی قابلیت استعداد ہے کہ ہم اپنے آپ کو جیسا چاہیں ویسا بنا سکتے ہیں۔ استعدادِ انسان کے متعلق اسی قدر پر کفایت کیجئے۔

انسان اور کائنات عالم سے تعلقات

اب اپنے اُس تصرف و تعلق کو دیکھئے جو انسان کا کائنات کے ساتھ ہے۔ اس تعلق کے جاننے کے بعد ایک عجیب پر فضا کامیابی کا میدان سامنے آ جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہمارے سوا جس قدر مخلوق ہیں خواہ وہ جماد یا نباتات یا حیوان ہوں، خواہ کائنات الجو[5] کے موجودات ہوں مثل سحاب و باراں وغیرہ، خواہ عالم علوی کی چیزیں ہوں مثل آفتاب، ماہتاب، نیر و مشتری وغیرہ سب کے سب ہماری خادم ہیں اور ہم مخدوم۔ ہر ایک سے ہماری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور ہر ایک سے ہم اپنا کام لیتے ہیں اور کام بھی اس طرح ہم ان سے لیتے ہیں کہ ان اشیا کو کسی وقت اپنی خدمت کے عوض کا نہ تو کسی طرح

---

[1] انحطاط۔ کم ہونا، گھٹنا/گھٹاؤ، نیچے اترنا، کسی چیز کا کمی کی طرف مائل ہونا، تنزل [2] غیر متناہی۔ جس کی انتہا نہ ہو، بے حد [3] التین: ۹۵: ۶-۴
[4] ''یعنی پھر نافرمانی کی وجہ سے انسان کو سب سے نیچے درجہ کی مخلوقات سے بھی نیچے کر دیا۔'' (عزیز الحق کوثر ندوی، علامہ۔ جواہر البیان فی تفسیر القرآن، جلد دوم، مطبوعہ بنارس) [5] کائنات الجو۔ آسمان اور زمین کے درمیانی فاصلہ/خلا کی دنیا

خیال ہوتا ہے اور نہ ہم بالعوض اُن کے کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں گویا کہ ہم سراپا مخدوم ہی مخدوم ہیں۔ صرف اُن کا استعمال میں لانا، اُن سے فائدہ حاصل کرنا یہی اُن کی خدمت ہے۔ قرآن شریف ہمارے اسی تعلق کو یوں بیان کرتا ہے إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً [1] پھر دوسری جگہ فرماتا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ [2] ان آیات سے کرامت و خلافت انسان کی مسلم ہو چکی۔ اب آگے بڑھئے ارشاد فرماتا ہے سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ [3] یعنی اللہ کے حکم سے ستارے، چاند، آفتاب، دن رات، سب تمہارے مسخر [4] ہیں۔ پھر فرماتا ہے سَخَّرَ لَكُمُ الْبَرَّ وَالْبَحْرَ دریا و زمین خشکی و تری تمہارے [5] مسخر کر دیئے۔ ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ عالم علوی تک کی پر شوکت چیزیں انسان کی مسخر ہیں، خود وہ زمین جس پر انسان آباد ہے اور سمندر جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہے یہ بھی انسان کے مسخر ہیں، ان چیزوں میں انسان اگر تصرف [6] کرے تو اس کا پورا حق ہے۔ لیکن زمین پر نبات و حیوان بھی ہیں شاید ان پر دست درازی [7] و انتفاع [8] کا دعویٰ غلط ہو اور یہ خود متصرف [9] ہونے کی حیثیت رکھتے ہوں۔ آیئے اس کا فیصلہ بھی کلام اللہ سے کریں۔ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُونَ [10]، ہم افتادہ زمین پر پانی بہاتے ہیں اس سے زراعتیں پیدا ہوتی ہیں کچھ تو خود کھاتے ہو اور کچھ تمہارے جانوروں کے چارے ہوتے ہیں کیا میرے اس کرم کو نہیں دیکھتے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ زمین جو کچھ اُگاتی ہے وہ سب ہمارے ہی لئے ہے، بعض کو ہم خود کھاتے ہیں اور کچھ حصے کو اپنے جانوروں کا چارہ بناتے ہیں۔ اب رہے حیوان، ان کا بھی فیصلہ کر لیجئے وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ [11] خلاصہ و مختصر ترجمہ اس کا یہ ہے کہ چار پائے میں نے تمہارے لئے پیدا کئے ہیں، اُن سے گوناگوں نفع حاصل کرتے ہو، جاڑے کا سامان اُن کے اُون سے بناتے ہو بعض کو ان میں سے کھاتے ہو صبح کو وہ چرائی کو جاتے ہیں یا شام کو جب واپس آتے ہیں تو اُن میں ایک قسم کا جمال دیکھتے ہو تمہارے بوجھ کو ایک شہر سے اٹھا کر دوسرے شہر پہونچاتے ہیں جس کا لیجانا تم پر شاق ہوتا، گھوڑے، خچر، گدھے، تمہاری سواری کے لئے پیدا کئے، اور بہت چیزیں تمہارے لئے اللہ پیدا کر رہا ہے جسے تم نہیں جانتے۔

اب تو ہر طرح اطمینان ہو گیا کہ یہ تمام چیزیں ہمارے ہی لئے ہیں یہ سب	ہماری مخدومیت کی غایت

1 "میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔" (البقرۃ:۳۰) 2 "اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو معزز کیا اور انھیں خشکی اور تری (دریا) میں سوار کیا۔" (بنی اسرائیل:۷۰) 3 النحل:۱۲ 4 مسخر۔ تسخیر/تابع کیا گیا، مطیع، فرماں بردار، مغلوب 5 خطاب میں یہ الفاظ لمبدم کے طور پر آئے ہیں۔ 6 تصرف۔ دخل کرنا/دینا، کام پر ہاتھ ڈالنا، استعمال، اختیار، قبضہ (۲) خرچ، صرف 7 دست درازی۔ ظلم، زیادتی (۲) مہد شکنی (۳) مار پیٹ (۴) لوٹ مار 8 انتفاع۔ فائدہ، نفع، حاصل، آمدنی (۲) نفع پانا/اٹھانا، فائدہ حاصل کرنا 9 متصرف۔ تصرف کیا گیا، قبضہ کیا گیا 10 السجدہ:۲۷ 11 النحل:۵تا۸

خدام ہیں اور ہم مخدوم[1] لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ہم صرف مخدوم ہی کیوں رہے۔ سلسلہ تو یوں ہے کہ جماد نبات کے کام آتا ہے اور نبات جماد کے کام تو نہیں آتا لیکن حیوان کے کام آتا ہے۔ اسی طرح حیوان نبات کے لئے کچھ مفید نہیں لیکن انسان کا مسخر و غلام ہے تو جبکہ یہ سلسلہ مخلوق میں پایا جاتا ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ کا خادم اور وہ اپنے سے بلند تر کا خادم تو پھر اس کی کیا وجہ کہ باوجود مخلوق و حادث[2] و ممکن[3] ہونے کے ہم کسی کے خادم نہ ہوں۔ تھوڑے سے غور سے یہ معما[4] حل ہو جاتا ہے کہ تمام مخلوق سے چونکہ انسان اعلیٰ و بالا قرار پایا ہے ہر چیزیں اس کی مسخر کر دی گئی ہیں، تو پھر اسے مخلوق کا خدمت گذار نہ ہونا چاہئے! بلکہ یہ تو خالق کا غلامی کرنے والا اور اسی کا عبادت گذار ہے اور صرف اسی غلامی نے اسے یہ مرتبہ دیا ہے کہ جس کے باعث یہ سب مخلوق پر حاکم ہے اسی امر کی طرف سعدیؒ نے اشارہ کیا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند	تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار	شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

اب ذرا اس طرف متوجہ ہوجئے کہ جب آفتاب و ماہتاب، نجوم و زمین و دریا وغیرہ وغیرہ سب ہمارے مسخر کر دئیے گئے تو اب ضرور ہوا کہ ہمیں اپنے تابعداروں سے کام لینے کا سلیقہ بھی ہونا چاہیئے ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ کس سے کونسا کام لینا ہے جس قدر ہمیں ان سے کام لینا کا طریقہ و علم زیادہ ہوتا جائیگا اسی مناسبت سے ہم اپنی حکومت میں کامل سمجھے جائینگے اور ہماری یہ حکومت اور ان تابعداروں سے خدمت لینا عین مرضی الٰہی کے مطابق ہوگا۔

تمدن و سائنس اور قرآن مجید

پس اے عزیزو! کیا تمدن کی روح اس کے سوا کوئی اور چیز ہے؟ کیا سائنس الٰہی اس امر کو منکشف[5] نہیں کرتا کہ کس چیز کو ہم کس طرح اپنے کام میں لائیں؟ اگر یہی بات ہے اور ضرور یہی ہے تو میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ تمدن و سائنس کی سنگ بنیاد قرآن کریم کی یہی تعلیمات ہیں۔ سائنس پڑھنا، اس میں کمال پیدا کرنا حقیقت میں مسخرہ مخلوق سے مستفید ہونا ہے اور ان کے مسخر ہونے کو بامعنی بنانا ہے۔ کوئی وجہ اس کی نہیں کہ قرآن ہمیں جن امور کی طرف رہنمائی کرے جن سے بہرہ مند[6] ہونے کی ترغیب دلائے ہم اسے مذہب کے خلاف سمجھیں پھر تو کھانا پینا، پہننا، رہنا سب ہی دشوار ہو جائیگا۔ رہی یہ بات کہ کونسی زبان میں ان علوم کو پڑھیں؟ اس تنگ وقت میں زیادہ بحث کا تو موقع نہیں لیکن اس قدر سمجھ لیجئے کہ اردو، فارسی، پنجابی، پشتو، بنگلہ وغیرہ وغیرہ تو جائز ہوں مگر یورپ کی زبان حرام

---

[1] مخدوم۔ خدمت کیا گیا/کیا ہوا، قابل تعظیم، آقا، بزرگ، سردار [2] حادث۔ نیا، نئی چیز، وہ چیز جو نئی پیدا ہوئی ہو اور پہلے سے نہ ہو، نیا امر ظہور میں آنے والا (۲) فانی، فنا ہونے والا [3] ممکن۔ جو بات ہو سکے، ہو سکنے والی بات (۲) (کنایۃً) مخلوق، انسان [4] معما۔ پوشیدہ/چھپی ہوئی چیز، مخفی، تہ کی بات۔ وہ بات، جو بطور رمز بیان کی جائے۔ (۲) ایک قسم کی چیستان (۳) الجھا ہوا مسئلہ، پیچیدہ بات [5] منکشف۔ کھلنے والا، ظاہر ہونے والا [6] بہرہ مند۔ صاحب نصیب، نصیبہ والا، خوش نصیب، خوش طالع، بیدار بخت، اقبال مند (۲) فائدہ پانے والا

آخر اس کی وجہ؟ اگر آج تمام یورپ یا کوئی اس کا حصہ دائرۂ اسلام میں آجائے تو کیا اسے اپنی مادری زبان کا بولنا یا اس میں پڑھنا حرام ہوجائیگا؟ کیوں خدا کی رحمت کو اس قدر تنگ کیا جائے؟ اور ترجیح بلا مرجح دی جائے؟ الحکمۃ ضالۃ المومن حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اپنی چیز جہاں بھی مل جائے اُسے فوراً اٹھا لو۔

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکان از بہر او جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

حضرات! کوئی وجہ اس کی نہیں کہ تعلیمات قرآنی سائنس کے سامنے سپر ڈال دیں۔ اور سائنس جاننے والا قرآن مجید کو (نعوذ باللہ) سُبکی کی نگاہ سے دیکھے یا اس کے فہم و تلاوت سے اپنے کو مستغنی سمجھے۔ اس لئے کہ سائنس کی بحث مادہ و متعلقات مادہ تک محدود ہے۔ حیات دنیا کو بارونق بنانا، لوازمات حیوانی کے لئے سامان فراہم کرنا اس کی غایت ہے لیکن قرآن کی تعلیم مادیات سے بہرہ مند ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے جذبات کو معتدل انفعال قلوب کو مزین بناتی ہے اس سے پھر آگے بڑھکر تربیت روح کی کرتی ہے معاد کی حیات کو آراستہ کرتی ہے اس مقام پر تو سائنس کے چھکے چھوٹتے ہیں، سائنس غریب کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

قابل گریہ نظارہ

اس بات کو خوب یاد رکھو کہ سائنس نے توحید و الوہیت نبوت و رسالت وحی و الہام وغیرہ سے کبھی بحث نہیں کی۔ چہ جائیکہ سائنس نے ان باتوں کا انکار کیا ہو۔ اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو یقین جانو کہ اس نے سائنس کو قطعاً نہیں سمجھا۔ یہ اس پر افترا رکھتا ہے بہتان رکھتا ہے، سائنس اس سے بیزار ہے اور اس بیجا حمایت سے فریادی ہے تم بھی ایسے شخص کی باتوں سے منہ پھیر لو اور اس کے لئے دعائے ہدایت کرو۔

دوستو! کیا یہ بے انصافی ہو گی کہ ہم اپنے حیلوں سے تو کام لیں کائنات سے بہرہ مند ہوتے رہیں! لیکن جس کی اطاعت کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں اس کی طرف بھول کر بھی توجہ نہ کریں! بلکہ اسے ایک لایعنی امر سمجھیں، یہ کیسی بے انصافی و صریح ہٹ دھرمی ہے۔ اگر یہ پہلو ہماری زندگی کا تاریک رہا تو ہم کمال انسانی کے عرفان سے قاصر ہے اور سخت باز پرس منعم حقیقی کی اپنے اوپر عاید کرلی بغیر اطاعت الٰہی و عبادت معبود جو زندگی بسر ہوئی وہ حیوانی حیات سے ایک انچ بھی بڑھ نہ سکی۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عبادت کی لذت سمجھانا نہایت ہی دشوار و اہم ہوگیا۔ تو اریخ سے یہ پتا چلتا ہے کہ جب دنیا میں علوم عقلیہ کے ساتھ لوگوں نے

۱؎ مُرَجَّح۔ ترجیح دیا ہوا، کسی پر فوقیت دیا گیا (۲) ترجیح دینے والا ۲؎ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، جلد ثانی، ص ۹۸، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی ۳؎ (حکیم سنائی غزنوی) "جو بات تم حق کے لیے کرو، وہ عبرانی ہو یا سریانی کوئی فرق نہیں پڑتا، جو جگہ تم حق کی خاطر ڈھونڈتے ہو وہ جابلقا ہو یا جابلسا ایک ہی بات ہے۔"
۴؎ سپر ڈالنا۔ ہتھیار ڈالنا، شکست کھانا، مغلوب/عاجز ہو جانا ۵؎ سُبکی۔ ہلکا پن (۲) بے قدری، بے عزتی، ذلت ۶؎ مستغنی۔ بے پروا، دولت مند
۷؎ مادیات (مادیت کی جمع) مادی ہونے کی کیفیت جسمانیت، جسمیت، اصلیت۔ سنسکا وہ نظریۂ فکر جس کے بموجب نعوذ باللہ منہا مادہ حقیقی اور قدیم ہے اور اس کو فنا نہیں ہے۔ ۸؎ عرفان۔ پہچان، تمیز، شناخت، علم (۲) پہچاننا (۳) اللہ تعالیٰ کی معرفت ۹؎ قاصر۔ کوتاہی کرنے والا ۱۰؎ منعم۔ نعمت دینے والا، مالدار، غنی (۲) آقا، مربی (۳) فیاض، داتا (۴) اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام۔

حد سے زائد غلو پیدا کیا تو وہ عبادت سے غافل و متہاون ہو گئے لیکن اس دور ایام کو کیا کہئے کہ ایک طرف تو جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے، دوسری طرف تدین سے دامانِ عمل خالی ہے۔ عامۂ مسلمین کی حالت کا اندازہ کر جاؤ تو خود معلوم ہو جائے گا کہ ہم راہِ مستقیم سے کس قدر منحرف ہو گئے ہیں: مساجد ہیں لیکن نمازی نہیں۔ قرآن کی جلدیں متعدد موجود ہیں مگر تلاوت نصیب نہیں۔ تجوید و عربی لحن سے قرآن پڑھنا آتا ہے لیکن اس پر عمل کی توفیق نہیں۔ عبادتیں ویران، معاملات تباہ، تعلقات پراگندہ، اخلاق ردی، پھر کیا امید بھلائی کی ہے؟

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا

اصلاح قوم کے لئے کوئی تجارت کی رغبت دلاتا ہے کوئی علوم مغربی کے سحر آفریں فضائل سناتا ہے کوئی علوم مشرقی کی ہدایت کرتا ہے کوئی صنعت و حرفت کی طرف مائل کرتا ہے؛ لیکن خدا تو یہ فرماتا ہے کہ تم میرے مطیع ہو جاؤ پھر سب چیزیں تمہاری تابع فرمان ہو جائینگی ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نپیچد ز حکم تو ہیچ [۶]

تم اللہ کے ہو جاؤ، تمام چیزیں تمہاری ہو جائینگی۔ تم اللہ سے پھر جاؤ گے تمام نعمتیں تم سے منہ موڑ لینگی ؎

چوں از دشتی ہمہ چیز از تو گشت
چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت۔

ہماری اخلاقی حالت اس درجہ بدتر ہو گئی ہے کہ عیب کو ہم ہنر سمجھنے لگے اور تلمیح کو کمالِ دانشمندی۔ یہ وقت اس کے بیان کرنے کا نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرما دے وہ کلام مجید کی تلاوت با ترجمہ کر جاوے اور اس میزان پر اپنے آپ کو تول لے کہ کہاں تک صدق و حق کا پلہ وزنی ہے اور کہاں تک تزویر و ریا کا۔ اخلاقِ حسنہ کہاں تک پائے جاتے ہیں اور کس حد تک اسے اپنے جذبات پر قدرت ہے؟ کس مرتبے تک حقوق العباد کے ادا کرنے میں وہ سرگرم ہے۔ میں اس وقت دو واقعے آپ کے سامنے گزارش کرونگا جس سے آپ اس امر کا فیصلہ کر سکینگے کہ اخلاق کی قوت کس درجہ ہے۔

معیارِ صداقت نبوت

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جبکہ ہرقل قیصر روم کے پاس اپنا قاصد بھیجا ہے تو اس نے عربوں کی اس جماعت کو جو اس کے ملک میں تاجرانہ حیثیت سے گئے ہوئے تھے تحقیق حال کے لئے طلب کیا۔ اب تم ذرا اس کو دیکھو کہ وہ کیا پوچھتا ہے اور ہر سوال کے جواب سے

ا غلو۔ ہجوم (۲) حد سے گزرنا، مبالغہ، بڑھا چڑھا ہونا ۲ متہاون۔ سستی کرنے والا (۲) حقیر، خوار ۳ تدین۔ دین داری، پرہیزگاری، دیانت داری ۴ پراگندہ۔ متفرق، منتشر، تتر بتر، پریشان، بکھرا ہوا ۵ ردی۔ بگڑا ہوا، نکما، ناقص، ناکارہ، خراب (۲) متذبذب، متفکر، متردد (۳) پریشان، حیران ۶ "تم بھی خدا کے حکم سے سرکشی نہ کرو تا کہ کوئی بھی تمہارے حکم سے سرتابی نہ کرے۔"

وہ کیا نتیجہ نکالتا ہے۔ میں یہاں پر حدیث کا وہ حصہ جو سوال و جواب پر ہے پورا پڑھکر سناؤنگا تاکہ آپ کو کامل لطف حاصل ہو اور صحیح فیصلہ کر سکیں۔ اُس کے دس سوال ہیں نمبروار سنتے جائیے۔

(۱) کیف نسبہ فیکم آن کا نسب تم میں کیا ہے؟ قلت ھو فینا ذو نسب مجیب کہتا ہے وہ ہم میں شریف النسب ہے" ہرقل اس جواب کو سنکر کہتا ہے کذالک الرسل تبعث الی النسب قومہا ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ قوم میں پیغمبر شریف ترین نسب کا ہوتا آیا ہے۔

(۲)

ھل قال ھذا القول منکم احد قط قبلہ۔ آن سے پیشتر دعوئی نبوت عرب کی سرزمین میں کسی اور نے بھی کیا تھا؟ جواب قلت لا۔ میں نے کہا نہیں۔ ہرقل کہتا ہے فقلت لو کان احد قال ھذا القول قبلہ لقلت رجل یاتسی بقول قیل قبلہ۔ تمہارا جواب نفی میں سنکر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر تم ہاں کہتے تو میں کہتا کہ یہ شخص ایک ایسا آدمی ہے جو اپنے سے پہلے کی ہوئی بات کی ریس کرتا ہے۔

(۳)

ھل کان من آبائہ من ملک۔ آباؤ اجداد میں اُس کے کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ فقلت لا میں نے کہا نہیں" ہرقل کہتا ہے قلت لو کان من آبائہ من ملک قلت رجل یطلب ملک ابیہ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر آباؤ اجداد میں اس کے کوئی بادشاہ گذرا ہوتا، تو میں کہتا کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جو باپ کا ملک اسی حیلہ سے طلب کرتا ہے۔

(۴)

فاشراف النّاس اتبعوہ ام ضعفاءھم قوم کے صنادید اُس کی پیروی کرتے ہیں یا ناتوان اشخاص؟ فقلت بل ضعفاءھم میں نے کہا بلکہ ناتوان اُس کے دین کو لبیک کہتے ہیں۔ ہرقل کہتا ہے ھم اتباع الرسل رسولوں کی پیروہی جماعت ہوتی چلی آئی ہے۔

(۵)

ایزیدون ام ینقصون۔ یو ما فیو ما بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں قلت بل یزید ون میں نے کہا وہ ہر روز بڑھتے جاتے ہیں۔ ہرقل کہتا ہے کذالک امر الایمان حتی تم ایمان کی یہی شان ہے یہاں تک کہ تمام ہو جاوے۔

(۶)

هل یرتد احد منہم سخطۃ لدینہ بعد ان یدخل فیہ اُس دین میں داخل ہوکر کوئی اس سبب سے مرتد بھی ہوجاتا ہے کہ اُس دین میں نفرت انگیز باتیں تھیں۔ فقلت لا۔ میں نے کہا "نہیں" ہرقل کہتا ہے۔ کذالک الایمان حین تخالط بشاشتہ القلوب ایمان ایسا ہی لطیف ولذیذ ہے کہ دل کو اس سے فرحت وانبساط ملتا ہے۔

(۷)

هل کنتم تتھمونہ بالکذب قبل ان یقول ما قال دعوائے نبوت سے قبل تم نے اُسے جھوٹ بولنے سے بھی متہم کیا ہے؟ فقلت لا۔ میں نے کہا "نہیں" ہرقل کہتا ہے۔ فقد اعرف انہ لم یکن لیذر الکذب علی الناس ویکذب علی اللّٰہ میں نے جان لیا کہ جس نے انسان پر جھوٹ نہیں رکھا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ رکھیگا کہ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

(۸)

فھل یغدر۔ دھوکا، فریب، یا نقض عہد[۱] کرتے ہیں؟ فقلت لا۔ میں نے کہا "نہیں" ہرقل کہتا ہے۔ کذالک الرسل لا یغدر رسول کی شان یہی ہے کہ وہ غدر[۲] نہ کرے۔

(۹)

هل قاتلتموہ۔ تم سے اُنسے کبھی لڑائی ہوئی؟ فقلت نعم میں نے کہا "ہاں ہوئی" ہرقل کہتا ہے فکیف کان قتالکم ایاہ اُن کے ساتھ تمھاری لڑائی کا کیا حال رہا؟ قلت الحرب بیننا وبینہ سجال ینال منا وننال منہ ہم میں اور اُس میں لڑائی مثل ایک ڈول کے ہے، کبھی ہم نے کھینچ لیا اور کبھی اُس نے۔

(۱۰)

ماذا یامرکم۔ تمھیں کیا حکم دیتے ہیں؟ قلت یقول اعبدو اللّٰہ ولا تشرکوا بہ شیئا واترکوا ما یقول اٰباؤکم ویامرنا بالصلوٰۃ والصدق والعفاف والصلۃ۔ میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو، اور اُس کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور تمھارے آبا و اجداد جو کہا کرتے تھے اُسے چھوڑ دو اور ہمیں حکم کرتے ہیں کہ ہم نماز پڑھیں، سچ بولیں، پارسائی اختیار کریں، اقرباسے صلۂ رحم کریں۔

[۱] نقض عہد۔ عہد شکنی، وعدہ خلافی [۲] غدر۔ عہد شکنی (۲) بے وفائی

یہ ہیں وہ دس سوالات جو ہرقل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں کئے حضرت سفیان بن حرب اس کے راوی ہیں، انھیں سے خطاب تھا، اور انھیں سے کلام، باقی جماعت خاموش تھی، حضرت سفیان اس وقت تک دولت اسلام سے مشرف نہیں ہوئے تھے، یہ فتح مکہ میں ایمان لائے ہیں۔ اب جبکہ سوال و جواب ختم ہو چکے اور ہر جواب پر ہرقل نے اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیا تو سب سے آخر میں تعلیماتِ محمدی کو پوچھتا ہے جو اس کا دسواں سوال ہے اور اس کا جواب پا کر یہ کہتا ہے:-

ان کان ما تقول حقا فسیملک موضع قدمی ھاتین وقد کنت اعلم انہ خارج ولم اکن اظن انہ منکم فلو انی اعلم انی اخلص الیہ لتجشمت لقاءہ ولو کنت عندہ لغسلت عن قدمیہ[1] یعنی یہ باتیں جو تم نے بیان کی ہیں، اگر سچ ہیں تو عنقریب وہ شخص اس جگہ کا مالک ہو جائیگا جو میرے قدموں کے نیچے ہے۔ میں نبی آخر الزمان کی بعثت کو تو جانتا تھا کہ ہونے والی ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ تم اہل عرب میں پیدا ہونگے۔ بہرحال اگر مجھے ان کے پاس تک پہونچنے کی امید ہوتی تو میں ان کی زیارت کے لئے ضرور مصائب سفر برداشت کرتا اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے قدم دھوتا۔

ایک غور طلب مسئلہ

فکر صحیح کیجئے ہرقل نے نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و فن سے سوال کیا، نہ آپ کے خزینہ و دولت کو پوچھا، نہ لشکر و سپاہ سے استفسار کیا، اور پھر کس سہولت سے فیصلہ کر دیا کہ بہت جلد وہ شخص قیصر کی سلطنت کا مالک ہو جائیگا۔ کس طرح اس کے دل نے عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کر کے عقیدت کا اظہار زبان سے کر دیا۔ اس نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ جو ذات ان اخلاق سے متصف ہو اور جس کی تعلیمات ایسی زبردست ہوں اس کے لئے ہر طرح کی کامیابی حتمی و یقینی ہے۔

ایک اور واقعہ

اب دوسرا واقعہ سنئے:- سب سے پہلے غار حرا میں جب آپ پر وحی نازل ہوئی تو آپ نے اپنے مکان پر تشریف لا کر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا لقد خشیت علی نفسی مجھے اپنی جان کا خوف ہے، اس وقت مجھے وحی کے معنی سمجھانے نہیں ہیں، مجھے تو اس کے ایک حصہ سے پسند لانی ہے اور وہ حضرت خدیجہؓ کا جواب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زمانے پر آپ نے دیا ہے:- قالت خدیجۃ کلا واللہ ما یخزیک اللہ ابدا انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق[2]۔ حضرت خدیجہ نے جواباً فرمایا: ہرگز نہیں

---

[1] صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد اول، ص ۴، نور محمد اصح المطابع۔ کراچی، طبع ثانی، ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء۔
[2] ایضاً، ص ۳

قسم اللہ کی اللہ تعالیٰ کبھی بھی آپ کو رسوا نہ کریگا آپ صلہ رحم فرماتے ہیں، اقربا کے حقوق ادا کرتے ہیں، یتیم عاجزو درماندہ[1] کی آپ غمخواری فرماتے ہیں اور لوگوں کو وہ چیزیں آپ عطا فرماتے ہیں جو سوا آپکے کسی اور سے نہیں مل سکتی، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، اور لوگوں کی حوادثات[2] حقہ پر مدد فرماتے ہیں"۔

اس حدیث کے ٹکڑے کو میں نے آپکے سامنے صرف اس غرض سے پیش کیا ہے تاکہ آپ یہ دیکھیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کس قدر اذعان[3] و اطمینان اس امر پر تھا کہ ایک ایسا شخص جس کی ذات میں یہ صفات پائے جاتے ہوں وہ ہرگز ہرگز ذلیل و رسوا نہیں ہو سکتا، یہ اعتقاد کیسا اچھا و صحیح ہے۔ تم تمام ملک کی تاریخ پڑھکر بھی کبھی ایسا شخص نہ بتلا سکو گے کہ جس میں عادات حسنہ صدق و راستی کے ساتھ پائے جاتے تھے اور وہ ذلیل و خوار ہوا ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی شریر النفس ظالم نے ایسے شخص کو اپنے جفا و ستم کے راہ میں کانٹا تصور کیا ہو اور محض اپنے خبث باطنی سے اس پر مظالم کئے ہوں، لیکن اس سے کیا ہوا، نہ تو ذرہ برابر اس کی عزت میں کمی آئی نہ اس کے اوصاف جمیلہ کا پایہ ہلکا ہوا، ہاں ظالم کی سیہ کاریوں میں ایک اور دھبہ البتہ بڑھ گیا۔

سنگِ بدگوہر اگر کاسۂ زریں شکند

قیمتِ سنگ نیفزاید و زر کم نہ شود[4]

حضرات! یہ ہے وہ ہدایت جس کی تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول کی بعثت فرمائی یہ ہے وہ نور علم جس سے جہالت کی تاریکیاں مٹ جاتی ہیں، یہ ہیں عادات جو انسان کو صحیح انسان بنا دیتی ہیں یہ ہے وہ دستور العمل جس سے ملک آباد اور دنیا بارونق پذیر ہوتی ہے جب تک اس علم سے حصہ نہ پائے انسانی زندگی نصیب نہ ہوگی۔

ہست اسلام سیرتِ نیکو

نہ ہمی جامہ و قد و دلجو[5]

جب علم کے پڑھنے سے خوف خدا پیدا نہو معاصی کی برائیاں معلوم نہوں جذبات پر قوت حاصل نہو۔ وہ تعلق جو خدا سے ہونا ضروری ہے پایا نہ جائے تو پھر اسے علم حقیقی کیونکر کہا جائے گا۔ علم حقیقی تو وہی ہے جس کے پڑھنے سے خشیت ایزدی دل میں پیدا ہوتی ہے اور یہی کیفیت دل میں پیدا ہو کر عالم و معاصی کے درمیان بطور پردہ کے حائل ہو جاتی ہے! اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک دربار رسالت سے لگاؤ نہ پیدا کر لیا جائے۔ جسقدر دل میں یہ لگن بڑھتی جائیگی اسی قدر عبادات صحیح اور معاملات درست ہونگے۔

ایک بہترین قانون معاش و معاد	معاش و معاد کی جمع کرنیوالی دین و دنیا کو مزین کرنیوالی

[1] درماندہ۔ بے کس، مجبور، عاجز، ناچار [2] حوادثات (حادثہ کی جمع الجمع) حادثے، مصیبتیں، تکلیفیں، زمانہ کی گردشیں [3] اذعان۔ یقین/ بھروسا/ اعتماد کرنا (۲) اقرار کرنا (۳) اطاعت کرنا، حکم ماننا [4] "گھٹیا پتھر اگر سونے کا پیالہ توڑ ڈالے تو (اس عمل سے) نہ تو پتھر کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، نہ سونے کی قدر و قیمت کم ہوتی ہے۔" [5] "اسلام اچھی سیرت کا نام ہے، خوب صورت لباس یا دلکش قد و قامت کا نہیں۔"

بجز تعلیم رسالت اور کوئی تعلیم روئے زمین پر پائی نہیں جاتی اس خاکدان[1] عالم میں وہ شمع (جس کے انوار میں دین و دنیا کی حسنات دکھلائی دیں) وہ بجز شمع نبوت کوئی دوسری شمع نہیں ہے۔ یہ نہ صرف دعویٰ اور دل خوش کن باتیں ہیں بلکہ واقعات و حقائق ہیں۔ اسلام سے پیشتر اور اسلام کے مابعد بھی غیر مسلمین میں تم کو اس امر کے شواہد ملینگے کہ باوجود علم وفضل پھر بھی یا دنیا[2] ان پر سر اپا چھا گئی یا دین کے سمجھنے میں ایسے اغلاط ان سے ہوئے کہ جس سے دین ایک ہولناک اور ناممکن العمل ہو گیا۔ مثلاً بعضوں نے قوائے فطری کو معطل و بیکار کر دینا انتہائے کمال سمجھا۔ ایسی جماعت کو اصطلاح میں آنعہ کہتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے اپنا ہاتھ اتنے عرصہ دراز تک اُٹھائے رکھا کہ اس میں جھکنے کی طاقت اور گرفت کی قوت باقی نہ رہی۔ کسی نے خاموشی اختیار کر لی اور نطق[3] کو خلاف تقوےٰ سمجھ کر چپ سادھ گئے۔ کسی نے طول قیام سے قدم کے اعصاب خشک کر دیئے اور اس کو مجاہدہ و ریاضت سے تعبیر کیا کسی نے رہبانیت[4] کو پاکبازی سے موسوم کیا۔ کسی نے دشت و جبل کو اپنا مسکن بنایا۔ غرض اس طرح کے خیالات اس جماعت کے ہوئے جنھوں نے دنیا میں آکر اور رہ کر بھی جائز تمتع سے بھی بہرہ مند ہونا اتقاء و تقدس کے منافی جانا۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ[5] کو نظر انداز کر دیا یعنی ان سے یہ تو کہو کہ اللہ نے جو یہ اشیاء اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں انھیں حرام کس نے کر دیا) اس جماعت کے برعکس ایک دوسرا گروہ ہے جس نے بجز حیاۃ دنیا اور کچھ نہ جانا۔ بہتر سے بہتر مکان میں رہنا، عمدہ سے عمدہ غذا کھانا، خواہشات نفس بلا لحاظ جا و بیجا جس طرح ہو سکے پورا کرنا، دولت جس ذریعہ سے ممکن ہو سمیٹنا اپنی زندگی کا ثمرہ قرار دیا۔ اسے اصطلاح میں لذتیہ کہتے ہیں ان کے نزدیک انسانی زندگی بس تمتعات دنیا سے بہرہ مند ہونیکا نام ہے۔ لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ[6] سے غافل ہو گئے یعنی اللہ کی یاد سے اولاد و مال تمھیں غافل نہ کرنے پائے۔

اب اس افراط و تفریط کے مقابلہ میں اسلام کی تعلیمات کی طرف غور کرو حکم ہوتا ہے وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا[7] (جو حصہ تیرا دنیا میں مقرر کر دیا ہے اسے نہ بھول) جائز وسائل و پاک ذرائع سے جس قدر ہو سکے وہ سب انسان کا حصہ ہے اسے حاصل کرنا چاہئے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی حصے کی طلب میں انسان اپنی عمر کا تمام زمانہ بسر کر دے اس لئے یہ ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ[8] (ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے خدا کو فراموش کر دیا۔ پھر اللہ نے بھی اپنی رحمت سے انھیں بھلا دیا اور خدا کا بھول جانا تو نافرمانوں کا شیوہ ہے) دیکھئے اصلاح معاش و فلاح معاد کے لئے

[1] خاک دان۔ مٹی اور کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ (۲) (مجازاً) دنیا [2] نطق۔ بولنا، بات کرنا (۲) بولنے کی طاقت، گفتار (۳) تقریر، لکچر، خطبہ۔
[3] رہبانیت۔ راہبوں کی طرح عبادت، دنیا چھوڑ دینا (۲) جائز لذات کو رضائے الٰہی کے لیے چھوڑ دینا (۳) عیسائی عابدوں کا ترک لذات اور زہد و پرہیزگاری کرنا۔ [4] الاعراف:۳۲ [5] المنٰفقون:۹ [6] القصص:۷۷ [7] الحشر:۱۹

کے لئے کیسے زریں اصول بتا دیئے گئے۔ تمام دن و رات اپنا کاروبار محنت و راحت کیا کرو۔ لیکن جب نماز کا وقت آ جائے تو چوبیس گھنٹے میں سے تھوڑا تھوڑا وقت یادِ اللہ میں بھی صرف کیا کرو جس کی دی ہوئی نعمت کھاتے ہو جس کے عطا کردہ قوٰی[1] سے کام لیتے ہو اُس کی بھی تو شکر گزاری چاہئے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی کا صدقہ ہے کہ دین و دنیا دونوں ہمیں نصیب ہوئے۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ[2] تعلیمات محمدی کا ایسا برزخ بیچ میں حائل ہے جس کی وجہ سے دنیا ہمارے دین کو تباہ نہیں کر سکتی دو دینداری ہمیں دنیا میں بہرہ مند ہونے سے مانع آ سکتی ہے ان باتوں کو سوچو غور کرو تو تمہیں اپنے مذہب کی قدر معلوم ہو گی پھر تمہیں اس سے تغافل[3] کرنے پر ندامت ہو گی جس کا نتیجہ تمہارے لئے فرحت بخش ہو گا۔ حدود دائرہ میں رہ کر جس قدر دنیا کی نعمتیں حاصل کر سکتے ہو۔ اطمینان سے کرو۔ اطاعت و عبادت کے ساتھ جس قدر چین و آرام تمہیں مل سکے اُس سے ہرگز محروم[4] نہ رہو۔ یہ کوئی اتقا[5] و پرہیزگاری نہیں ہے بلکہ مکر و فریب ہے۔ اسی طرح یہ نفس کا دھوکا ہے جس نے تمہیں اصل زمانہ کی کورانہ[6] تقلید کو آراستہ و پیراستہ کر کے ایک دلفریب شکل میں لا کر کھڑا کر دیا ہے جسے تم کبھی علم کی شان سمجھتے ہو اور کبھی شرافت انسانی اُس کا نام رکھتے ہو اور کبھی حیات اجتہادی و حریت سے تم سے موسوم کرتے ہو اور کبھی روشن دماغی و وسیع الخیالی اُس کا عنوان قائم کرتے ہو۔ ایک مرتبہ سچے دل سے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ پڑھ کر اپنے اصلاح کی طرف جھک پڑو ہدایت خداوندی تمہیں لپک کر کھنچی ہوئی خود اپنے آغوش میں لے لیگی اُس وقت تمہیں حقیقی شرافت و سچی حریت نصیب ہو گی بسم اللہ پڑھ کر اُٹھو اور اس تمام آلودگی سے اپنے دامن عزت کو صاف کر ڈالو۔

دلا تا کے دریں کاخ مجازی	نبی مانند طفلاں خاک بازی
بہ بیتاں بال و پر ز آمیزش خاک	بہ پر تا کنگرۂ ایوان افلاک[5]

دیکھو آزادی کے معنی ہم تمہیں بتلائیں ذرہ ٹھنڈے دماغ سے فرصت کے وقت اسے سوچنا۔

خلاف فطرت آزادی

انسان اگر اپنے اقوال و افعال میں اس طرح آزاد ہونا چاہے کہ جو منہ میں آئے کہے جائے اور جس طرح جو چاہے کئے جائے تو ایسی آزادی قطع نظر نفرت انگیز ہونے کے یقینا محال و ممتنع[6] الوجود ہے۔ اب لامحالہ کسی قواعد و اصول کا پابند ہو کر کچھ کہیگا یا کریگا اُس کے قول و فعل کا ایک دائرہ محدود ہو گا اور اُس کے وسعت کی ایک حد ہو گی اب ذرا اسے سوچو کہ محدود دائرہ میں جو کچھ کہ ایک انسان کہہ سکتا ہے یا کر سکتا ہے کیا اُس کے وہ قول و فعل آزاد ہیں۔ ایک غائر نظر اس کا

1. قُوا (قوت کی جمع) قوتیں، طاقتیں 2. الرحمٰن: ۱۹و۲۰ 3. تغافل۔ جان بوجھ کر غفلت کرنا (۲) بے پروائی، بے التفاتی، کم توجہی (۳) تساہل، سستی 4. کورانہ۔ اندھوں کی طرح 5. "اے دل اس مجازی محل (دنیا) میں کب تک بچوں کی طرح خاک بازی کرتے رہو گے۔ مٹی کی آمیزش / وابستگی سے بال و پر جھاڑ دو اور آسمانوں کے ایوان کے بام تک اڑان بھرو۔" 6. ممتنع۔ منع کیا گیا، باز رکھا گیا، روکا گیا۔

جواب تمھیں نفی میں دینگی اس لئے کہ صدور قول و فعل خیالات کے بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں پہلے ایک شے دماغ میں آتی ہے پھر قوت متخیلہ[1] اس پر غور کرتی ہے اس کے بعد ان خیالات کا اظہار اقوال و افعال سے کیا جاتا ہے حکما کا قول ہے کہ اگر کسی کے خیالات کی بلندی و پستی مطالعہ کیا چاہو تو اس کے کلام و حرکات و سکنات پر متجسسانہ[2] نظر ڈالو اس لئے کہ اعمال و افعال صور خیالیہ کے آئینہ ہیں اس سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ قول و فعل آزاد نہیں بلکہ خیال کے پابند ہیں اب آؤ خیال کو دیکھیں اس کا کیا حال ہے[3] ایک دقیق بیں نگاہ اسکو بھی معلومات کا تربیت کا صحبت کا رسم و رواج کا مقتضیات[4] ملک وغیرہ وغیرھا کا مقید پاتی ہے۔ جو خیال کہ انسان کے دماغ میں آتا ہے وہ نتیجہ ہے اس کی معلومات کا یا اس سوسائٹی کا جس میں اس نے نشو و نما پایا ہے یا ملک کی رسم و رواج نے یہ خیال پیدا کر دیا ہے۔ یا گرد و پیش کے واقعات کا اثر ہے۔ غرض انھیں چیزوں سے خیال متاثر ہوتا رہتا ہے اور ان کے قیود سے نکل نہیں سکتا۔ الحاصل جب اقوال و افعال خیالات کے تابع ہوئے اور خیالات معلومات و تربیت و سوسائٹی وغیرہ کے قید خانہ میں مقید رہے تو پھر آزادی کا نام ایک ایسا عنوان ہے جس کا معنون[5] نہیں۔ ایسا لفظ ہے جس کا خارج میں وجود و معنی نہیں۔ اب سوچئیں یہ فیصلہ ٹھہر اٹھیں کہ خدا لگتی کہو ہم اپنے خیالات کو تعلیمات و صحبت و طرز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیوں متبع نہ بنائیں۔ کیا مدینۃ العلم کی تعلیم کے سوا کوئی دوسری تعلیم حکومت کرنے کے لئے زیادہ سزاوار ہے؟ کیا اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ[6] کی تربیت سے کوئی تربیت زائد بہیں حریت بخش ہے؟ ہرگز نہیں کبھی نہیں ؎

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد
کہ بستگانِ کمندِ تو رستگار انند[7]

تعلیم نبوی کا معجزنما نتیجہ

یہ کوئی امر اعتقادی نہیں بلکہ واقعی ہے کہ تاجدار مدینہ نے محض اپنے دامن تربیت میں عرب جیسے جاہل و وحشی قوم کو لیکر چند دنوں میں کمالات کا مجسمہ بنا دیا اور دنیا کے لئے اپنی تعلیم و تربیت و صحبت کا ایک بے نظیر نمونہ چھوڑ گئے جو شخص عرب کے اس انقلاب کی طرف دیکھتا ہے سر دھنتا ہے۔ دماغ اس کا چکر میں آجاتا ہے اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ دم کے دم میں تاریکی روشنی سے جفا وفا سے قطع وصل سے فساد صلح سے عداوت محبت سے ذلت عزت سے خیانت امانت سے معصیت طاعت سے کدورت[8] صفائی سے بدل کر دنیا کا رنگ ہی پلٹ دیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم یہی تھی وہ ہدایت جس کے لئے دنیا پیاسی تھی اسی آب حیات[9] کا ذکر ہے اس آیہ کریمہ میں ھُوَ الَّذِیْ

[1] قوت متخیلہ۔ خیال میں لانے/سوچنے کی قوت، قوت خیال، خیال پیدا کرنے کی طاقت (۲) وہ طاقت، جو صور قبولہ کو غائب میں محفوظ رکھتی ہے۔
[2] متجسسانہ۔ تحقیقی، بطور جستجو [3] بقول پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد: 'خیال' کی عظمت سے کسے انکار ہے؟ قوموں کی آبادی و بربادی اسی 'خیال' کی کج روی و راست روی پر منحصر ہے۔ [4] مقتضیات۔ تقاضا کیے گئے، چاہے گئے، خواہش کیے گئے (۲) (مجازاً) مراد، مطلب (۳) موقع (۴) مصلحت [5] معنون۔ عنوان کیا ہوا/کیا گیا/لکھا گیا، دیباچہ کیا گیا، ابتدا کیا گیا، ڈیڈیکیٹ کیا گیا (۲) کسی کے نام سے منسوب کیا گیا، نامزد کیا گیا۔ [6] "بلاشبہ آپ یقیناً بہت بڑی شان والے خلق پر ہیں"۔ (القلم:۴) [7] "ان پیچ دار زلفوں سے حافظ کی خلاصی کبھی نہ ہو کیوں کہ جو اس کمند میں بندھے ہوئے ہیں، وہی نجات یافتہ ہیں۔"
[8] کدورت۔ گدلاپن، تیرگی، آلودگی، تجھٹ [9] آب حیات۔ آب بقا، زندگی کا پانی، ہمیشہ کی زندگی بخشنے والا پانی، وہ پانی جس کو پی کر کبھی موت نہیں آتی۔

اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا [1]- اس قدر بیان جو توحید ورسالت وتعلیمات اسلامی کے متعلق ہوا۔ اس سے غرض یہ تھی کہ قرآن پاک کی عظمت برہان وحجت کے پہلو سے آپ حضرات کے سامنے پیش کروں تاکہ ارباب استدلال کو یہ معلوم ہو جائے کہ مذہب کا بازو اس حیثیت سے بھی بہت قوی ہے۔ اگر منصفانہ نگاہ سے کوئی قرآن کی تلاوت سمجھ کر کر جائے تو بیش بہا جواہر اسکے خزائن اُسے ہر سورہ میں ملیں گے۔ میں نے تو صرف طالب ہدایت کے لئے ایک طریقہ بیان کر دیا ہے۔

اب تقریر کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے جس کے پورا کرنیکے بعد میں اپنے ایفائے عہد سے سبکدوش ہو جاؤنگا۔ اور وہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال میں ہوگا جس سے آپ کا خاتم النبیین ہونا واضح واجلی ہو جائیگا۔ گو مسئلہ رسالت کی بحث میں بحث رسول بھی متضمن [2] ہے لیکن اپنا دل یہی چاہتا ہے کہ اسے ایک مستقل عنوان قرار دوں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ

احتیاج نصب العین

انسان جس طرح ایک کامل وجامع دستور العمل کی طرف محتاج ہے اسی طرح اُسے اس کی بھی حاجت ہے کہ کوئی ذات اس کی نگاہ کے سامنے ایسی ہو جس کی عملی زندگی اعلیٰ تشریح وتفصیل دستور خداوندی کی ہو۔ جس کی خلوت وجلوت کی باتیں جس کے حرکات وسکنات جس کا خورد وخواب خدا کے فرمان کے بموجب ہو اور اُس کی ذات پر وہ تمام واقعات گذر گئے ہوں جن سے انسان کا دوچار ہونا لابد [3] ہے۔ تاکہ اُس کی زندگی کے تمام شعبہائے حیات ہمارے لئے ایک عمدہ نمونہ بنکر رہبری کرنے والے ہوں اور ہم سی امر میں کسی دوسرے کے محتاج نہوں۔

ایک جامع کمالات ذات

تواریخ عالم کے جاننے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسی ذات جو ہر طرح کے کمالات کی جامع ہو بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائی نہیں جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف قرون میں مختلف باکمال اشخاص سے دنیا رونق گیر رہی ہے کسی میں شجاعت کا جوہر تھا اور کسی میں حلم وکرم کا وصف کوئی ان باکمالوں میں سلطان ذی جاہ تھا اور کوئی تمام تعلقات سے علیحدہ ہو کر فانی فی اللہ باقی باللہ کا مجسمہ۔ لیکن وہ ذات جو تمام کمالات کا مجموعہ ہو وہ تو صرف اُسی تاجدار مدینہ کی ذات ہے۔ شریعت کی تعلیم اُسی اُمت نوازسے تھی تزکیۂ [4] نفس اُسی روح پرور کے انفاس قدسیہ سے تھا۔ میدان جنگ میں وہ ایک بڑے سپہ سالار کی صورت میں دکھائی دیتا۔

---

[1] الفتح: ۲۸ [2] متضمن۔ مشتمل، شامل، مشمولہ، داخل، مندرج (۲) ملا ہوا، ضمن میں لینے والا/لیا ہوا۔ [3] لابد۔ قطعی، یقیناً، بے شک (۲) مجبوراً، ناچار، ناگزیر، ضرور بالضرور [4] تزکیہ۔ پاکی، صفائی، پاک کرنا، صاف کرنا۔

انتظامات ملک میں ایک بڑا مدبر سلطان تھا۔ نزاعات باہمی و مناقشات کو فیصل کرنے میں ایک بے نظیر حاکم عادل تھا۔ پھر باوجود ان تمام کمالات کے صبر، بردباری، عفو، تواضع، حیا، مروت، سخا، وقار، حفظ مراتب، شجاعت ان سب اوصاف کا علی وجہ الکمال ایک مرقع تھا۔ آپ رحمۃ للعالمین کا وجود صحابۂ کرام کے لئے گوناگوں کمالات کا ایک سلسلۃ العلوم تھا جس کی زندگی کا ہر صفحہ ایک مبسوط رسالہ تھا اور صحابۂ کرام آپ کے مطالعہ میں ہمہ تن مصروف تھے۔ تواریخ میں تم پڑھو گے کہ وہ لوگ جن کے دل کا لگاؤ حرب و ضرب سے ہوتا ہے جب میدان کارزار میں اترتے ہیں تو دشمن کے لئے بجز برش شمشیر و نوک سناں ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے یہ سبق اپنے اصحاب کو پڑھایا کہ ایسے سخت ہیجان و جوش میں بھی وہ جذبۂ مروت کو ضائع نہ کریں۔ ایک واقعہ سنو، جنگ بدر کے وقت کفار کی جماعت میں ایک کافر ابو البختری بھی آتا ہے۔ بمقابلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اس وقت جبکہ آپ مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے اور کفار طرح طرح کی اذیتیں آپ کو دیتے اور اشاعت اسلام میں گوناگوں رکاوٹیں پیدا کرتے تھے) ابو البختری نے سکوت سے کام لیا تھا۔ آپ کی صرف اس قدر رعایت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حد خیال تھا۔ کہ اس حال میں جبکہ کفار کے ساتھ وہ بھی لڑنے کو آیا ہوا تھا۔ آپ نے اصحاب کو یہ ہدایت فرمائی کہ اگر ابو البختری کا مقابلہ ہو جائے تو اسے قتل نہ کرنا بلکہ زندہ میرے پاس اماں دیکر لے آنا اس لئے کہ وہ قیام مکہ کے وقت میرے آزار کا موجب نہ ہوا تھا۔ یہ ایک بیش بہا مروت کی مثال آپ نے جنگ کے وقت دشمن کے مقابلہ میں قائم فرمائی۔ دوسرا واقعہ سنو، جنگ بدر میں جبکہ کفار کو ہزیمت ہوئی اور ستر قیدی اسیر لائے گئے تو ان میں ایک حضرت عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ قیدیوں کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ آنحضرت کا خیمہ قیدیوں سے قریب تھا۔ حضرت عباس بندش کی سختی سے کراہتے، رحمۃ للعالمین کا دل مضطرب ہو گیا۔ حکم فرمایا کہ عباس کے بند کھول دیئے جائیں اس کے ساتھ ہی حکم ہوا کہ جتنے قیدی ہیں سب کے ہاتھ کھول دو۔ کسی کی مشک تنگ بھی نہ رہے یہ دوسرا سبق رحمت و شفقت کا ہے فاتح قوم کو یہ درس دیا گیا کہ مفتوح اشخاص کو اپنے فاتحانہ جوش کا مشق نہ بناؤ۔ مہربانی و شفقت کو دشمن سے بھی دریغ نہ رکھو۔

مالک صادق سے کام لو تو یہ خصلت و عادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمہیں ایک معجزہ معلوم ہوگی۔ مرتبہ انبیاء جلیل الشان کہ خاتم النبیین اللہ تعالیٰ نے فرما دیا۔ آپ کے بعد دوسرا نبی یا رسول ہونا محال و ممتنع بالذات۔ رسالت ایسی عامہ و تامہ کہ تمام دنیا کا رسول بنا کر اللہ نے بھیجا لیکن اس پر تواضع و انکسار کی

۱ نزاعات (نزاع کی جمع) جھگڑا، تنازع، کھینچ تان، کشاکش، خصومت، تکرار (۲) دشمنی، بیر، عداوت (۳) فساد، فتنہ، قضیہ ۲ مناقشات (مناقشہ کی جمع) باہمی لڑائی جھگڑا، نزاع، قصہ، فتنہ، قضیہ ۳ مرقع۔ تصویروں کی کتاب، البم (۲) قطعات رکھنے کی کتاب (۳) (کنایۃً) لاجواب۔
۴ گوناگوں۔ رنگ: رنگ/طرح طرح کا، رنگارنگ/طرح بطرح ۵ بُرِش۔ کاٹ، تیزی، کاٹنا ۶ مروّت۔ بہادری، مردانگی، مردی، جواں مردی (۲) خُلق، اخلاق، انسانیت، آدمیت (۳) (مجازاً) احسان۔

کا یہ عالم کہ شکستہ حالوں میں مل کر بیٹھ جاتے اور فرماتے مسکین جالس عند المساکین[1] (ایک مسکین ہے جو مسکینوں میں بیٹھا ہوا ہے) تہذیب ایسی ارفع واعلیٰ کہ تمام عمر نہ کوئی فحش کلمہ زبان پر آیا نہ کسی کو کبھی گالی دی کسی ذاتی امر کے لئے نہ تو کبھی غصہ فرمایا نہ کسی کام کا اپنی ذات کے لئے حکم فرمایا۔ ان امور کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جبکہ اس کے بلندی رتبہ کو ذرا لحاظ کرو۔ اللہ تعالیٰ یوں حکم دیتا ہے۔[2] لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ (یعنی نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو اور نہ اسے اس طرح پکارو جیسا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہو) صحابہ کی حالت یہ کہ دربار رسالت میں اس طرح مودب بیٹھتے تھے کہ جسم میں حرکت تک نہیں ہوتی تھی گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اس پیغمبر کی ذرہ نوازی و وسعت اخلاق یہ کہ ہر ایک کی دل دہی و دل جوئی ہو رہی ہے ایک مرتبہ دربار رسالت آراستہ ہے۔ مجلس میں اس کثرت سے صحابہ حاضر ہیں کہ کہیں جنبش تک کی جگہ باقی نہیں ایسے وقت میں ایک اعرابی آتا ہے اِدھر اُدھر دیکھ کر صف نعال[3] میں بیٹھ جاتا ہے حضور سے جو اس قدر دور جگہ پائی تو اس سے شکستہ خاطر ہوتا ہے فوراً اخلاق محمدی بڑھکر اس شکستہ دل کی خبر لیتا ہے آنحضرت نے اپنی ردائے[4] مبارک اس کی طرف پھینکی اور فرمایا اے شخص تو اس کو بچھا کر وہاں بیٹھ جا۔ اب دیکھ لو اگر ایک شخص دولت قرب سے مالا مال ہے تو صف نعال کا بیٹھنے والا بھی اپنا دماغ اس کے ہم پلہ پاتا ہے کہ میرے پاس وہ چادر ہے جو جسم اطہر سے لپٹی رہتی ہے۔

اس قوت و رعب کے ساتھ عدل کا ایسا خیال کہ جنگ بدر کے موقع پر آپ اصحاب کی صفیں مرتب مسلسل فرمارہے ہیں۔ سواد بن غزیہ ذرا صف سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک تیر بغیر پیکان[5] کے ہے جس سے آپ صفوں کو سیدھا فرمارہے تھے۔ سواد کو صف سے نکلا ہوا دیکھ کر آپ نے تیر کی لکڑی سے ایک کوچہ[6] ان کے پیٹ میں دیکر فرمایا کہ صف میں داخل ہو۔ حضرت سواد صف میں داخل ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی اس کا عوض دیجئے معاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ شکم مبارک سے اٹھالیا اور فرمایا کہ عوض لے لو حضرت سواد نے شکم مبارک کو بوسہ دیا اور لپٹ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہے۔ سواد عرض کرتے ہیں کہ آج کا معرکہ سخت ہے تھوڑی دیر میں دشمن سے دست وگریبان ہونگے ہو سکتا ہے کہ یہ وقت میری زندگی کی آخری ساعت ہو۔ اس لئے میری تمنا تھی کہ میرا بدن آپ کے جسم مقدس سے اس طرح ایک دفعہ مل جائے کہ کوئی کپڑا وغیرہ بیچ میں حائل نہ ہو۔

[1] یہاں الخطاب میں مفہوماً کہا گیا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے۔ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا (اے باری تعالیٰ مجھے مسکینوں میں زندہ رکھ)۔ ترمذی شریف رقم الحدیث ۲۳۵۲، دار السلام۔ ریاض، طبع ۲۰۰۰ء ...... اسلام کا آغاز غربت کے عالم میں ہوا اور عنقریب وہ غربت کی طرف لوٹ جائے گا (پس خوش خبری ہے غرباء کے لیے)۔ الحدیث [2] الحجرات: ۲ [3] نعال (نعل کی جمع) جوتے، پاپوش [4] ردا۔ اوڑھنے کی چادر
[5] پیکان۔ تیر، برچھی، بھالے یا نیزے کی نوک/انی [6] کوچہ/کوچا۔ نوک دار چیز بھونکنا، کسی نوک دار چیز کا تھوڑا سا زخم، کچوکا۔

یہی آخری توشہ[1] اس عالم سے میرا ہوگا۔ آپ نے یہ سنکر انھیں دعائے خیر فرمائی ؎ زجرمے کز کمال عشق خیزد + کجا معشوق با عاشق ستیزد[2]۔ اس کشادہ دلی وعدل کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ اقوام عاجز ہے۔ اپنی عملی زندگی سے اس طرح اخلاق شفقت۔ رحم، مروت عدل کا سبق دنیا کو کس نے دیا یہ مضمون جس قدر کہ وسیع ہے اسی قدر دلکش بھی ہے مگر افسوس ہے کہ نقیر حسب دلخواہ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ آپ حضرات بھی اس وقت معاف فرمائیں۔ کیا کہا جائے ؎ دلم خزینۂ اسرار بود دست قضا + درش ببست و کلیدش بدلستانی داد[3]

غایت کمال انسانی

اب صرف ایک واقعہ مختصر چند جملوں میں گزارش کرونگا جس سے طرح طرح کے کمالات محمدی آپ کو معلوم ہونگے اور وہ واقعہ فتح مکہ کا ہے۔ کہ مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ داخل ہوتے ہیں یہ وہی جگہ ہے جہاں لوگوں نے اپنی اذیت رسانی سے چین کی سانس لینی دشوار کردی تھی۔ بالآخر خدا کے بیت معظم سے اللہ کے رسول کو جدائی اختیار کرنی پڑی۔ قوم نے اس وقت نہ تو قرابت کا لحاظ کیا تھا نہ شرافت خاندانی نظر میں لائی تھی نہ آپکے اخلاق کریمانہ کا کچھ پاس کیا تھا جب آپ ہجرت فرماکر مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہوئے تو وہاں بھی اطمینان سے بیٹھنے نہ دیا۔ برابر مدینہ پر چڑھ چڑھ کر گئے اور متعدد بار اللہ کے حبیب کے مقابل ہوئے۔ غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوہ خندق وغیرہ وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔ رسول اللہ صلعم اپنے خالق کی عبادت ادا کرنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ وعدہ فرماتے ہیں کہ صرف عمرہ ادا کرلینے دو فوراً مدینہ کو واپس چلا جاؤنگا۔ کسی امر سے یا کسی شخص سے کسی طرح کا تعرض[4] نہ کرونگا۔ مگر اہل مکہ نہیں مانتے ہیں۔ آج اللہ تعالیٰ فتح عطا فرماتا ہے۔ شیاطین کے تخت الٹے جاتے ہیں توحید کے سر پر آرائی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حبیب دس ہزار مجاہدین کی جمعیت سے داخل مکہ معظمہ ہوتا ہے۔ مجاہدین اس شان سے داخل ہوتے جاتے ہیں کہ ہر قبیلہ اپنا علم ہاتھ میں لئے ہوئے اپنے سردار کے ساتھ ہے۔ ایک ایک قبیلہ ترتیب سے گزرتا جاتا ہے۔ تکبیر وتہلیل کے دل کپکپا دینے والے نعرے بلند ہو رہے ہیں سب کے بعد تاج الانبیا فخر الرسل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی جماعت کے ساتھ گزرتے ہیں جن میں مہاجرین وانصار ہیں بیچ میں آنحضرتؐ کا ناقہ ہے اور اس کے گرداگرد جاں بازوں کا حلقہ۔ سب کا لباس سبز ہے تمام وکمال اسلحہ جنگ سے مرصع ہیں خود وزرہ نے تمام بدن چھپا رکھا ہے بجز آنکھوں کی تپلی کے اور کوئی حصہ جسم مبارک کا دکھلائی نہیں دیتا اس شان حق کو دیکھکر عرب کے بہادروں کے دل دہل گئے کلیجہ کانپنے لگا۔ جب آنحضرتؐ مقام ذی طویٰ پر تشریف لائے تو کچھ توقف کیا۔ عہد سابق یاد آجاتا ہے۔ کفار کے مظالم کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

---

[1] توشہ۔ زادراہ، راستے کا خرچ [2] "ایسے جرم کی پاداش میں جو عشق میں انتہا کی وجہ سے سرزد ہوا ہو، معشوق اپنے عاشق سے کہاں لڑائی کرتا ہے۔" [3] "میرا دل اسرار کا خزینہ تھا موت کے ہاتھوں نے اُس کا دروازہ بند کردیا اور اس کی چابی کسی دلربا کو دے دی۔"

[4] تعرض۔ مزاحمت کرنا، روکنا، حائل ہونا (۲) روک ٹوک، مزاحمت (۳) پیش آنا، درپے ہونا، تنگ کرنا (۴) اعتراض کرنا۔

اب بجائے اس کے کہ جوشِ انتقام دل میں اٹھتا یا علو و افتخار نفس میں پیدا ہوتا نہایت تذلّل[1] و انکسار سے ناقہ کے کجاوہ پر چادر کا کونہ ڈالکر سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ خدا کی جناب میں جبہہ سائی[2] ہے اور آپ کے فضل و کرم پر شکر گزاری۔ سعد بن عبادہ کے منہ سے جوش میں یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ آج کعبہ کی تاخت[3] و تاراج حلال ہوگی فوراً انھیں اس کہنے سے روکا جاتا ہے اور اُن سے جھنڈا لیکر انھیں تو لشکر میں داخل اور جھنڈا حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ کے حوالہ فرمایا جاتا ہے۔

عجز و انکسار اس فتح و قوت پر تو دیکھ چکے اب ذرا اس مقام کو دیکھو نقیب و منادی ہر طرف پھیل گئے ہیں۔ پکارتے جاتے ہیں کہ جو مسجد حرم میں داخل ہو جائے اُسے امان ہے۔ جو سفیان کے گھر میں چلا جائے اُسے امان ہے جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے اُسے امان ہے جو ام ہانی کے مکان میں داخل ہو اُسے امان ہے۔ جو ہتھیار ڈال دے اُسے امان ہے۔ غرض ایک امان کی صدا تھی جو در و دیوار سے گونج رہی تھی۔ اس رحمت و کرم کو دیکھ کر کفار مشرکین کا دل بھی آمنڈ آیا۔ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر رونق افروز ہو کر بیعت اسلام لیتے اور ہدایت کی جامع نصیحت فرماتے۔

اسی حالت میں ہندہ زوجہ ابوسفیان جس کے کفر و غیظ کی شدت اس سے ظاہر ہے کہ حضرت حمزہ عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کچا کلیجہ اس نے چبایا تھا حاضر خدمت اقدس ہوئی ہے مسلمانوں کے خوف سے تمام جسم چادر میں لپیٹ لیا تھا کہ مبادا کوئی پہچان کر حضرت حمزہ کی بیحرمتی کے عوض کہیں قتل نہ کر ڈالے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم پر اِس قدر اطمینان تھا کہ جب سامنے پہونچی تو نقاب رخ سے اٹھا دیا اور عرض کیا کہ میں ہندہ زوجہ ابوسفیان ہوں۔ آپ کو اپنے چچا کی حالت یاد آگئی۔ اُس کی جانب سے منہ موڑ لیا۔ اُس نے فوراً اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده و رسوله باٰواز بلند پڑھا۔ کلمہ طیبہ کا اُس کی زبان سے نکلنا تھا کہ سارا ملال دل سے جاتا رہا۔ یہ تھے جوشِ انتقام، صاحبو! ان واقعات کو قصے کی طرح نہ سنئے۔ سوچئے غور کیجئے کہ کیا فاتحانہ جوش اسی کا مقتضی[4] تھا کہ اماں اماں کی صدا پکار دی جائے۔ لوگوں کے مکانات و متاع و آبرو سے کچھ تعرض[5] نہ کیا جائے۔ انتہا یہ کہ اگر جوش میں بھی کوئی جملہ منہ سے کسی کے نکل جائے تو اُس سے آزردہ ہوں۔ ایک ایسی قوم پر جس نے مدتوں مشقِ ستم مسلمانوں کو بنائے رکھا ہو یہ الطاف و کرم کئے جائیں نہ فتح سے نفس متلذذ[6] ہوتا ہے نہ اس شوکت و غلبہ پر کچھ فخر کرتا ہے۔ وہی نیاز و سجود ہے اور وہی عبادت نہ دعوت کے جلسے ہیں نہ جشن کی مجلسیں نماز کا وقت ہوتا ہے حضرت بلال اذان دیتے ہیں اور

---

۱ تذلّل۔ نرم ہونا، عاجزی کرنا، فروتنی کرنا ۲ جبہہ سائی۔ ماتھا/ پیشانی رگڑنا، سجدہ کرنا ۳ تاخت و تاراج۔ برباد/ تہس نہس/ ستیاناس کرنا، حملہ کر کے تباہ کر دینا ۴ مقتضی۔ تقاضا کرنے والا، چاہنے والا، خواہش کرنے والا، خواہاں ۵ تعرض۔ پیش آنا، درپے ہونا (۲) چھیڑنا، تنگ کرنا (۳) اعتراض کرنا (۴) مزاحمت کرنا، روکنا، حائل ہونا ۶ متلذذ۔ لذت اٹھانے والا، ذائقہ چکھنے والا، لطف اٹھانے والا۔

اللہ کا محبوب اپنی امت کو لیکر مسجد حرام میں آٹھہریں بعد ازاں اپنے خالق کی نماز ادا کرتا ہے یہ وہ باتیں ہیں کہ سننے میں جس قدر خوش آیند ہیں عمل میں اسی قدر معرکۃ الآرا ہیں کوئی دوسری مثال تم کسی قوم کی پیش نہ کر سکو گے یہ سلطنت اور ہے اور نبوت و رسالت کچھ اور۔ یہ تجلیات ختم رسالت کی تھیں اس کا مقابلہ ملمع کاری[1] و تلعی سازی[2] کیا کر یگی ؎

دہان یار کجا و زبانِ سوسن کو

نہ ہر گلے کہ بخندد مقرری داند[3]

دور کیوں جایئے حالت موجودہ کو لے لیجئے۔ اس وقت یورپ نے تہذیب کا وہ غلغلہ[4] بلند کیا کہ کتنی مسلمان کی اولاد اُن کے اس ہنگامے میں ایسی تہ وبالا ہوئی کہ اسلامی معاشرت اسلامی لباس اسلامی صورت یہاں تک کہ اسلامی نام سے اُسے چڑ ہو گئی۔ خواب میں بھی یورپ کا جلوہ ہے اور بیداری میں بھی اسی کا تصور۔ اب جو یورپ کے حصص باہم لڑ پڑے تو تہذیب و تمدن کا جامہ اُن کے جسم سے الگ ہو گیا اور ان کی وحشت اور بربریت صاف صاف ہر شخص کو نظر آنے لگی۔ جرمنی جس نے تہذیب و انکشافات[5] علمیہ میں تمام یورپ سے اپنی استادی کا سکہ منوالیا تھا۔ جب میدان جنگ میں اترتا ہے تو بلجیم کے ساتھ صرف اتنی بات کہ اُس نے راستہ دینے سے انکار کیا تھا اور اپنی خود مختاری و حقوق کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا کیسا عبرتناک سلوک کیا۔ پھر جب استاد کی یہ حالت ہو تو شاگردوں کا کیا پوچھنا۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

حیاتِ محمدی کا ایک دوسرا پہلو

اب ایک نظر اپنے پیغمبر کے اس پر انوار حصہ زندگی پر ڈالئے جس کا تعلق محض خالق سے تھا۔ باوجود ان گوناگوں مہمات اور مختلف خدمت و اصلاح عباد کے عبادت الٰہی میں وہ کس طرح مستغرق ہے۔ امت کی تعلیم و تربیت۔ کفار و مشرکین یہود و نصاریٰ کی مدافعت۔ اہل و عیال کی کفالت۔ غرض طرح طرح کے اہم امور روزانہ درپیش ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ پر باحسن وجوہ انجام پا رہے ہیں مگر کیا مجال کہ ان مصروفیتوں میں اور کچھ صلوٰۃ و صیام میں کچھ گرانی بھی ہونے پائے۔ حضرت عائشہ صدیقہ آپ کی نماز تہجد کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتی ہیں کہ فلا تسئل عن طولهن وحسنهن (اب نہ پوچھو کہ وہ کس قدر دراز اور کس قدر خوب صورت نمازیں ہوتی تھیں) تمام رات قیام میں بسر فرماتے اور ایک حالت ذوق و شوق میں کلام اللہ پڑھتے جاتے رات ختم ہو جاتی اور عبادت کی تمنا باقی ہی رہ جاتی۔ یہاں تک کہ قدم مبارک ورم کر گئے۔ اس واقعہ کی خبر قرآن کریم

---

[1] ملمع کاری۔ ملمع کا کام، وہ چیز جس پر سونے یا چاندی کا پانی چڑھایا ہوا ہو (۲) منافقت (۳) (کنایۃً) ظاہری ٹیپ ٹاپ [2] قلعی سازی۔ سفیدی پھیرنا (۲) وارنش، ہر انگ کا ملمع، برتنوں پر رانگ چڑھانے کا عمل۔ [3] "یار کی زبان کہاں اور دہان سوسن کہاں، ہر وہ پھول جو کھلتا ہے بات کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔" [4] غلغلہ۔ دھوم، شور، آواز (۲) غل، غوغا (۳) دھاک، شہرہ [5] انکشافات (انکشاف کی جمع) ظاہر ہونا، کھلنا (۲) کھولنا

یوں دیتا ہے طٰهٰ ۚ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ۙ اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی [1] (اے حبیب قرآن ہم نے اس لئے نہیں نازل کیا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ بیہ تو ڈرنیوالوں کیلئے ایک نصیحت ہی)۔

حضرت! اس پر لطف مضمون کو کہاں تک بیان کروں ؎ نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں[2]۔ صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہوگا کہ عبادت ہی آنحضرت کی چین تھی اور یہی آپ کا آرام تھا۔ اس کے سوا کسی چیز میں آپ کو لذت نہیں ملتی تھی جب کبھی طبع لطیف حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکدر[3] ہوتی تو حضرت بلال سے فرماتے کہ اَرِحۡنِیۡ یَا بِلَالُ[4] (اے بلال مجھے راحت پہنچاؤ) حضرت بلال اذان دیتے۔ اس کبیر المتعال[5] کا نام ترتیب اذان میں سنکر اس پیکر عشق الٰہی کو عجب فرحت و انبساط ہوتا[9]

دل زندہ می شود بامید وصال یار + جاں رقص می کند بسماع کلام دوست[6]

دل میں ایک طرب انگیز حقیقی سرور پیدا ہوتا اور ہر بن مو[7] بادۂ محبت الٰہی میں مخمور ہو جاتی۔ شوق پیدا محراب عبادت میں کھڑا کر دیتا اور وہ خدا کا محب و محبوب نماز میں مصروف ہوکر عالم ناسوت و ملکوت[8] طے کرتا ہوا لِیۡ مَعَ اللّٰہِ وَقۡتٌ لَا یَسَعُنِیۡ فِیۡہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرۡسَلٌ[9] پر پہنچکر مشاہدۂ تجلیات شاہد حقیقی میں مصروف ہوجاتا اور فارغ ہوکر اپنی اُمت سے فرماتا کہ قُرَّۃُ عَیۡنِیۡ فِی الصَّلٰوۃِ[10] میرے آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

ختم کلام

اے حضرات۔ غور کرو۔ یہ بے سروپا زندگی کب تک۔ ہفوات[11] ولایعنی کلیات کا ورد کہاں تک۔ عمر گراں بہا[12] کا صرف کس حد تک آؤ ہم اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار دیں تاکہ ہمارے اقوال و افعال ایک محور پر گردش کریں۔ جب تک اقوال و افعال کا کوئی محور قرار نہ دینگے اس وقت تک ہماری زندگیاں صحیح نتیجے پر نہ پہونچینگے۔

زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اس سے لیل ونہار و تغیرات موسم پیدا ہوکر طرح طرح کے گل کھلاتے ہیں اور کیسے عجیب و غریب فوائد ہیں اس سے حاصل ہوتے ہیں۔ پس ہمارے اقوال و افعال اگر ایک محور پر گردش کرینگے تو کیا ان سے مفید نتائج حاصل نہونگے؟ ہونگے اور ضرور ہونگے۔ پس

[1] طٰہٰ: ۱تا۳ [2] (مصرع) نہ آپ کے حسن کی کوئی حد ہے اور نہ سعدی کی بات کا کوئی انجام۔ [3] مکدر (کنایۃً) غمگین، رنجیدہ

[4] یَا بِلَالُ اَرِحۡنَا بِالصَّلٰوۃِ۔ مسند احمد بن حنبل، احادیث رجال من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، رقم الحدیث ۲۲۴۷۶، ۵/۳۶۵، بیت الافکار الدولیۃ۔ اردن، ۲۰۰۳، ص ۱۶۹۹ [5] کبیر المتعال۔ خدائے بزرگ و برتر۔ [6] "محبوب کے وصال کی امید سے دل زندہ ہوجاتا ہے۔ دوست/محبوب کی آواز سن کر روح رقص کرنے لگتی ہے۔" [7] بن مو۔ بال کی جڑ، رُواں [8] عالم ناسوت و ملکوت۔ فانی عالم اور فرشتوں کی دنیا

[9] "اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب کا ایک خاص وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کسی مقرب فرشتے اور نبی کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔" [10] کشف الخفاء، حصہ دوم، ص ۲۰۷، رقم الحدیث ۲۱۵۹، طبع اول، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۵۲ھ؛ المقاصد الحسنہ، رقم الحدیث ۹۲۶، ص ۳۵۸، طبع اول، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۷ء [11] سنن نسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب حب النساء، حصہ دوم، ص ۲۷۰، طبع اول، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی [12] ہفوات (ہفوۃ کی جمع) بیہودہ اور لغو باتیں [13] گراں بہا: بہت قیمتی، بیش قیمت۔

اب ہمیں ایک محور تلاش کرنا ہے مگر اس کی تلاش میں ہمارا زیادہ وقت رائگاں نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہم کو جب یہ معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے پیغمبر روحی فداہ نے کونسا محور[۱] اپنی حیات کا قرار دیا تھا تو ہم نہایت سہولت سے اس میں کامیاب ہو جائینگے۔ آؤ قرآن شریف ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کا یہ محور بتلاتا ہے۔[۲] قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہدے اے میرے محبوب کہ میری نمازوں کا پڑھنا عبادتوں کا کرنا یہاں تک کہ جینا اور مرنا سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام عالم کا رب ہے ؎

عاشقی دانی چہ باشد بے دل و جاں زیستن + جان و دل در باختن بر بوے جاناں زیستن[۳]

پس معلوم ہوا کہ اگر ہمارے تمام اقوال و افعال اس محور کے گرد چکر لگائیں تو زبان بھی آفات سے محفوظ اور جوارح[۴] ہر معاصی سے امن میں رہ سکتے ہیں۔ خدا کو حاضر و ناظر جانو۔ پھر جو چاہو کہو اور جو چاہو کرو اور جہاں چاہو جاؤ۔ یہ وہ خیال ہے اور اس کا ایسا تصرف ہے کہ تمھیں لغو و بیہودہ اقوال و افعال سے اس حال میں بھی باز رکھیگا جس حالت میں کسی قانون بشری کی نگاہ یا اس کا پنجہ گرفت تم تک نہیں پہونچ سکتا ہوگا۔ زبردست سے زبردست قانون زبان و اعضا کو ارتکاب جرائم سے البتہ باز رکھتے ہیں اور ان پر حکومت کر سکتے ہیں لیکن دلوں پر حکومت کرنے والا اور معاصی کی بنیاد قلب سے زائل کرنے والا تو صرف خدا ہی کا خوف اور اسی کی یاد اور اسی کا نام ہے۔ پس اے دوستو۔ صدق و اخلاق سے للّٰہیت کو اپنی زندگی کا محور قرار دو اور بے کھٹکے نہایت کامیاب شاداں و فرحاں اس دار المحن[۵] سے سفر کر جاؤ۔ اب اس سے زیادہ کیا کہوں ؎

گفتگو آئین درویشی نبود

ورنہ با تو ماجراہا داشتیم[۶]

آہ اے گلشن اسلام کیا ہوئی تیری وہ بہار جس نے اپنے فیض کرم سے خار زار جفا کو لالہ زار وفا بنا دیا تھا، سوکھی کلیاں لبہائے جاناں کی طرح تر و تازہ پنکھڑیاں نکال لائی تھیں ہر شاخ نخل ثمار خوشگوار سے باردار تھی، اور ہر برگ ایک ایک رگ میں لاکھوں چشمے سرسبزی کی امانت رکھتی تھی، تیری باد سموم[۷] یورپ کی نسیم سحر سے کہیں بڑھ چڑھ کر خدمت صبا انجام دیتی تھی، اس کا ایک جھونکا غنچہ ہائے سربستہ کو کھلا دیتا تھا۔ اب وہی تو ہے وہی تیرے مرغان طرب کی صدائیں ولیکن نہ کوئی کان ان کو سننا گوارا کرتا ہے نہ کوئی دماغ ان سے راحت پاتا ہے عقل کو حیرت ہے اور ذہن کو چکر کہ آخر دیکھتے دیکھتے یہ رنگ چمن کیونکر بدلا، باغبانی کی خدمت جن کے قبضۂ قدرت میں دی گئی تھی وہ کیوں تہ[۸] سے نئے

۱ محور۔ وہ شے جس پر کوئی چیز گھومے یا گردش کرے، آلہ (۲) (اصطلاح علم ہیئت) وہ فرضی خط جس کے گرد زمین گردش کرتی ہے۔ ۲ الانعام: ۱۶۲
۳ "جانتے ہو کہ عاشقی کیا ہے؟ بے دل و بے جاں زندہ رہنا، جان و دل ہار جانا اور محبوب کی خوشبو پر زندہ رہنا۔" ۴ جوارح (جارحہ کی جمع) آدمی کے ہاتھ پاؤں، زبان اور دوسرے اعضا۔ ۵ دار المحن (محن محنت کی جمع) امتحانوں مصائب، دکھوں، تکلیفوں، بلاؤں کا گھر
۶ (حافظ شیرازی) "بحث مباحثہ درویشوں کا شیوہ نہیں ورنہ ہمیں بھی تم سے کافی کچھ کہنا سننا تھا۔"

تنڈولی و بیڈولی کوئی شاخ نہیں دیکھتے چاٹتے پر تلے بیٹھے ہیں۔ قرآنی تدبروں کی نہریں اسی طرح جاری ہیں پر تشنہ لب طلب العطش العطش کی رٹ لگائیں۔ احادیث کریمہ کے حوض اسی طرح بھرے ہوئے ہیں پر دراز آستین والے ایک قطرہ بھی نہ پائیں۔ فقہ کے مسائل اسی طرح حاجت روا لیکن قوانین مجریہ کے ہاتھوں اعضا شکنی کے شکار۔ تصوف کے نکات طالب راہ کے واسطے اسی طرح مشعل ہدایت مگر علوم جدیدہ کی بھول بھلیاں کی بدولت اندھیر کا ڈھیر۔ علم کلام حل مشکلات فلسفہ میں مخزن حکمت مگر عقول عل و عقد سے دفتر پارینہ بیساکھی تیرے رفیق نہیں، امرا تیرے غمگسار نہیں۔ نہ بوریہ میں تیرا جلوہ نہ مسند میں تو رونق بخش۔ افسوس! اے

اے صبا مایۂ سودا نہ تو داری و نہ من

بوئے آں زلفِ چلیپا نہ تو داری و نہ من

اللھم افتح لنا بالخیر واختم لنا بالخیر واجعل عواقب امورنا بالخیر بیدک الخیر انک علیٰ کل شیٔ قدیر وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ من ھو الاول و الاٰخر والظاھر والباطن وھو بکل شیٔ علیم۔

تحریر کردہ بقلمہ

فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ

قصبہ بہار۔ محلہ میر داد

۳۴۷۶۳

... ب۔ تنڈول کا، زیبا، خوش نما، خوش وضع، خوب صورت (۲) نہایت سڈول ے بے ڈول۔ بدنما، بدقطع، بدوضع، بدزیب۔

العطش۔ کلمۂ اظہار پیاس ے "اے صبا، سرمایۂ جنون نہ تو رکھتی ہے، نہ میں۔ اُن گھنگھریالی زلفوں کی خوشبو نہ تیرے پاس ہے، نہ میرے پاس۔"

CALL No. ٨٩١٤٣٨٥ / ١٤٣٩٥ س   ACC NO. ١٣٤٦٣

AUTHOR سلیمان اشرف

TITLE الخطاب

KED AT THE TIME

Date	No.	Date	No.
12.10.03	۹۹		

MAULANA AZAD LIBRARY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1-00 per volume per day shall be charged for text-books and 10 Paise per volume per day for general books kept over-due.

کتب خانہ مولانا آزاد علی گڑھ کے ذخیرہ میں نسخہ **الخطاب** کے اجراء کارڈ کا عکس

بہ زبانِ ناشر

۱۸۵۷ء کے کٹھن اور پُر آشوب دور کے معاً بعد اسلامیانِ ہند کو اپنے ملی وجود کو درپیش سخت اور نازک چیلنج سے نبرد آزما ہونے اور مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سر سید احمد خان نے اس عظیم خدمت کا بیڑا اُٹھایا اور 'انقلاب بذریعہ تعلیم' کا نعرہ بلند کیا۔ سر سید کی تعلیمی تحریک کا اولین عملی قدم محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کا قیام تھا، جس کا نام بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہو گیا تا کہ لوگوں کو آل انڈیا نیشنل کانگرس سے اس تنظیم کی الگ اور منفرد حیثیت کا احساس ہو۔

کانفرنس کے اجلاسوں کی صدارت سربر آوردہ ماہرانِ تعلیم نے فرمائی۔ سالانہ جلسوں میں کی جانے والی تقاریر اور ہر خطبہ اپنے قومی نقطۂ نظر کے علاوہ جہاں ایک طور سے صاحبِ خطبہ کے نہاں خانۂ دل کا مجلّا آئینہ اور رجحانات کا ورق کشادہ ہوتا ہیں ان اجلاسوں میں قوم کی ترقی کی تدبیریں سوچی جاتیں، اور قابلِ عمل تجاویز مرتب کی جاتیں، متفرق اور منتشر قوم کو منظم اور مجتمع کرنے کے لیے غور و خوض ہوتا۔ باہمی صلاح و مشورہ سے قوم کی ترقی کا سیدھا راستہ نکالنے کی سعی کی جاتی۔

اس صدارتی خطبہ میں قوم کو یاد دلایا گیا تھا کہ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوں گی بچوں کی تعلیم و تربیت معقول طریقہ سے نہ ہو گی، کیوں کہ تعلیم کی ابتدا آغوشِ مادر سے ہوتی ہے۔ چند سال کی پیہم تبلیغ و ترغیب کے بعد مسلمان تعلیمِ نسواں کی ضرورت کا دم بھرنے لگے۔ یہ شاید حالات کا جبر اور بعض اہلِ وطن کی تنگ نظری کی وجہ سے ملازمت کے دروازے مسلمانوں کے لیے بند ہونے کے خطرہ کے باعث صنعتی و تجارتی تعلیم کے حاصل کرنے کی ضرورت بھی مانی جا چکی تھی۔ ورنہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر مسلمان صنعت و حرفت پر متوجہ نہ ہوئے تو وہ کسبِ معاش کے زرخیز

وسائل سے محروم رہ جائیں گے۔

تعلیمی کانفرنس کے زیرِ اہتمام پڑھے جانے والے خطباتِ صدارت جیسا کہ گزشتہ صفحات میں آچکا کوئی چالیس سالوں (۱۸۸۶ء تا ۱۹۲۵ء) پر محیط ہیں۔ آج سے نوّے (۹۰) سال قبل شائع ہونے والے خطبات کی اہمیت وافادیت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ اور مسلمانوں کی تعلیم پر بتدریج ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے!!...... یہ آپ 'خطبات عالیہ' کے مقدمہ نگار فاضلِ ندوہ مولانا محمد اکرام اللہ خاں صاحب کی زبان بلاغت نظام سے سُنیے۔

"آپ ان خطبات کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تعلیم کے متعلق کتنے جدید مسائل پیدا ہو گئے اور ملک کی سیاسی واقتصادی حالت نے مسلمانوں کی تعلیم پر کیسا زبردست اثر ڈالا ہے یہ چیزیں آپ کو کسی دوسری کتاب سے معلوم نہیں ہو سکتیں لہٰذا اِس پہلو سے بھی خطبات کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے مفید و سود مند ہے۔"

کانفرنس کے سالانہ اجلاس متحدہ ہندوستان کے مختلف صوبجات میں علی گڑھ، لکھنؤ، لاہور، الٰہ آباد، دہلی، شاہ جہاں پور، میرٹھ، کلکتہ، رام پور، مدراس، آگرہ، بمبئی، ڈھاکہ، راولپنڈی اور دیگر مقامات پر جن صاحبانِ علم و حکمت کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوئے، کے بارہ مولوی انوار احمد زبیری (مارہروی) رقم فرماتے ہیں۔

"جن باوقار لوگوں نے کانفرنس کے جلسوں کی صدارت کے فرایض انجام دیئے ہیں وہ اپنی مختلف النوع قابلیتوں اور اوصاف کے لحاظ سے اپنے اپنے دورِ زندگی میں اس پایہ کے بزرگ تھے اور ہیں جن کا مرتبہ نہ صرف علمی حیثیت سے بلند نظر آتا ہے بلکہ ان کی اصابتِ رائے اور ان کی قومی ہمدردی کی وجہ سے بھی خواہانِ قوم کے سربرآوردہ طبقہ نے اُن کو منصبِ صدارت پر منتخب کر کے عملاً اُن کے فضل و کمال کا اعتراف کیا۔" (دیباچہ: خطباتِ عالیہ، حصہ اول)

ان خطبات میں خطبہ صدارت مولوی سر رحیم بخش (۱۹۱۴ء) ایک نمایاں اور قابل ذکر حیثیت کا حامل ہے۔ جس کی اہمیت اور افادیت اس کے مندرجات پڑھنے کے بعد ہی سمجھی جا سکتی ہے۔ ہم کوئی تبصرہ کیے بغیر یہ کام قارئین کرام پر چھوڑتے ہیں۔

ناشر

فیہا کتب قیمۃ

خطباتِ عالیہ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے

چہل سالہ خطباتِ صدارت کا مجموعہ

حصۂ دوم

(از اجلاس بست ویکم تا اجلاس سی ام)

جس میں ہر معزز صدر کے قابل مطالعہ وسبق آموز حالاتِ زندگی مع فوٹو کے چھاپے گئے ہیں

مُرتبۂ

مولوی انوار احمد صاحب زبیری (مارہروی)

حسب الارشاد جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

زیرِ اہتمام مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئے ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء

(صدر دفتر کانفرنس نے شائع کیے)

بار اول ؛ ۱۰۰۰ جلد

عکس سرورق: خطباتِ عالیہ حصہ دوم مرتبہ مولوی انوار احمد زبیری، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۸ء

اجلاس بست و ہشتم

(منعقدہ راولپنڈی سنہ ۱۹۱۴ء)

صدر مولوی حاجی سر رحیم بخش صاحب خان بہادر کے سی آئی ای پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی ریاست بہاولپور

حالات صدر

مولوی سر رحیم بخش ان منتخب افراد قوم میں سے ہیں جو اپنے زور بازو سے اُٹھ کر اعلیٰ مدارج کے ان بلند درجوں پر پہنچے جن کی آرزو بڑے سے بڑے نام آور شخص کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ نسل اور قومیت کے لحاظ سے "راجپوت" مسلمان ہیں جن کا ابتدائی نشو و نما ان کے اپنے وطن موضع (مسکہ میران جی) ضلع کرنال میں ہوا۔ اپنے وطن کے ورنیکولر مدرسہ میں وہ پڑھنے کے لئے بیٹھے اور مڈل پاس کر کے پانچ روپیہ کا وظیفہ قابلیت حاصل کیا جس کے بعد نارمل اسکول دہلی میں داخل ہوئے اور درجہ بدرجہ اپنے تعلیمی معیار کو بلند کر کے نوکری کرنے پر مجبور ہوئے سنہ ۱۸۶۹ء میں ان کو مدرسی کی ملازمت ملی جن کی ابتدائی تنخواہ پندرہ ۱۵ اور پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار تک تھی۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں ترقی کر کے چیفس کالج لاہور کی صدر مدرسی پر پہنچے۔

ان کی زمانہ مدرسی میں سابق ہز ہائینس نواب صاحب مرحوم بہاولپور چیفس کالج میں زیر تعلیم تھے۔ نواب صاحب کے لئے ایک لائق مصاحب کی تلاش تھی مولوی صاحب کے اوصاف نے ان کے اس منصب کی سفارش کی جو مصاحبت کے بعد سنہ ۱۸۹۲ء میں ہز ہائینس کے ایڈی کانگ مقرر ہو کر اسسٹنٹ

خطبات عالیہ حصہ دوم، طبع علی گڑھ کا صفحہ ۲۰۰

کی ملازمت سے وابستہ ہو گئے اور پانچ برس تک پوری وفاداری اور قابلیت کے ساتھ
۱۹۰۶ء میں اس ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی مدت ملازمت کے لحاظ سے وہ مستحق
پنشن نہ تھے لیکن ان کی عمدہ خدمات نے خاص پنشن کا مستحق بنا دیا تھا۔ کچھ
عرصہ تک وہ اپنے وطن میں خانہ نشیں رہے اس کے بعد ضلع مظفرنگر اور کرنال کی ریاست
منڈال کے منیجر مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک فرائض منیجری انجام دے رہے
تھے جو اس دوران میں ہز ہائینس نواب صاحب بہاول پور نے دوبارہ یاد کر کے پرائیویٹ
سکرٹری کی خدمت پر طلب کر لیا، اور ایک سال کے اندر ریاست کے چیف جج مقرر ہوئے،
اور پھر ۱۹۱۰ء میں فارن سکرٹری کے عہدہ پر ممتاز کئے گئے۔ اُنھوں نے اپنی محنت،
دیانت، وفاداری اور اعلےٰ درجہ کی قابلیتِ انتظامی کے لحاظ سے اور اپنے مضبوط
کیرکٹر کی وجہ سے اپنے اعتبار اور وقار میں حیرت انگیز ترقی کی یہاں تک کہ جب نواب صاحب
کا انتقال ہوا اور ریاست میں انتظامی کونسل کا تقرر گورنمنٹ پنجاب کے زیر نگرانی عمل
میں آیا، تو ۱۹۰۷ء میں کونسل آف ریجنسی کی صدارت عظمیٰ کا عہدہ آپ کو پیش کیا گیا۔
جنھوں نے برسوں اس عہدے کے اہم فرائض کو اس وقت تک جب تک کہ رئیس حال
با اختیار نہ بنائے گئے پوری خوش اسلوبی پوری وفاداری اور اعتماد باہمی کے ساتھ
انجام دینے کی کامیاب اور نیک نام کوشش کی۔ ایک طرف برٹش گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام
نے ان کی خوش انتظامی تدبر کو تسلیم کیا تو دوسری طرف وہ رئیس اور ریاست کے پورے
وفادار اور خیر اندیش ثابت ہوئے۔ اور وہ ہمیشہ اپنی بڑی ذمہ داریوں کے مقابلہ میں
رئیس، رعایا اور حکام کی نظروں میں اعتبار اور عزت کی نظر سے دیکھے گئے انھیں خدمات
جلیلہ کے اعتراف میں ۱۹۰۹ء میں ان کو سی، آئی، ای کے خطاب سے گورنمنٹ انگریزی
نے سرفراز کیا۔

۱۹۱۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے سنٹرل پبلسٹی بورڈ میں بطور ایک مسلمان ممبر کے
آپ کا تقرر ہوا اور جنگ عظیم کی خدمات کے صلہ میں جو ریاست نے انجام دی تھیں ۱۹۱۹ء
میں کے سی آئی ای بنائے گئے اس کے علاوہ متعدد اسناد و تمغہ جات و نشانات اعزازی
بہت سے مواقع پر برٹش گورنمنٹ سے حاصل کئے اور اب زمانہ دراز کے بعد خدمات ریاست
سے جدا ہو کر بحصول پنشن و انعام خاص مختلف ملکی و قومی خدمات میں حصہ لے رہے ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ سادہ اور عملی زندگی کو اپنا نصب العین قرار دینے کی کوشش کی وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے پابند مذہب اور با اخلاق مسلمان ہیں۔ جب وہ ریاست میں بااختیار اور ذمہ دار حاکم تھے اُس وقت سے مختلف ملکی انسٹی ٹیوشن اور قومی درس گاہیں اُن کی روشن خیالی فراخ قلبی اور ہمدردی کی رہین منت ہیں اور رہیں گی وہ آج اُس جیفیس کالج لاہور کی مجلس انتظامی اور کونسل کے رکن ہیں جس میں کبھی ان کی حیثیت ایک معمولی مدرس کے درجہ پر تھی وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ و کونسل کے ممبر اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے لائف ممبر ہونے کے علاوہ انجمن ترقی تعلیم مسلمانان امرت سر کے صدر رہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کی زندگی میں مرحوم کی تحریک و کوشش سے پچاس ہزار کا سب سے بڑا عطیہ مجلس ندوۃ العلماء کی جماعت کو دارالعلوم ندوہ کی تعمیر میں بہاول پور کی محل سرا شاہی کی جس خاتون محترم نے عطا کیا تھا وہ آپ کی اس علمی دل چسپی کا نتیجہ تھا جو آپ کو اس مذہبی علمی مجلس اور اس کے دارالعلوم کے ساتھ ابتدائے کار سے آج تک مسلسل طور پر وابستہ کئے ہوئے ہے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس و دیگر مجالس ہائے قومی کی صدر نشینی کی عزت بھی رہاان کو مل چکی ہے۔

چنانچہ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۹ء کے اجلاس ہائے کانفرنس منعقدہ راول پنڈی و خیرپور اسٹیٹ میں وہ دو مرتبہ صدر بنائے گئے اسی طرح ۱۹۱۵ء میں بمقام لکھنؤ اجلاس ندوۃ العلماء کی صدارت فرمائی ۱۹۲۳ء و ۱۹۲۴ء میں انجمن مسلم راجپوتانہ پنجاب کی انجمن کے صدر تھے۔ آل انڈیا تنظیم کمیٹی کے عارضی طور سے اور آل انڈیا تبلیغ الاسلام کے مستقل صدر رہیں۔

سال گزشتہ میں اضلاع اودھ اور ممالک متحدہ آگرہ کے اکثر مشرقی اضلاع کا تنظیم کمیٹی کے سلسلہ میں مسلسل طور پر کئے مہینے آپ نے دورہ کرکے قوم کو دعوتِ علم و عمل دینے کی کوشش فرمائی ہم نے بہت سے قومی کام کرنے والوں کے جوش عمل کو دیکھا ہے قومی خدمت کے لئے پیرانہ سالی میں اس عظیم جفاکشی اور شہر شہر مہینوں دورہ کرنے کی جو مثال انھوں نے پیش کی ہے یہ مثال ان جیسی حیثیت کے لوگوں میں نظر نہیں آتی غرض بہترین اخلاق اور خصائص عملی کے لحاظ سے سر موصوف کا کارنامۂ حیات قومی ہمدردی "سیلف ہیلپ" اور خودداری کے لحاظ سے قوم میں ایسا زندہ نمونہ ہے جو ہر لحاظ سے قابل تقلید اور لائق عمل ہے۔

خطبۂ صدارت

خواتین وحضرات! ایسے لمحے بھی انسان کی زندگی میں آتے ہیں جب کہ اس کو کام یا فرض کی انجام دہی کے متعلق جو اس پر عائد ہوتا ہے اپنی دماغی ناقابلیت کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اس وقت میرے اوپر بھی ایسا یا تقریباً ایسا ہی احساس غالب ہے۔ یہ پنڈال جو سرسید احمد جیسے نیک نہاد و عاقل و فرزانہ، نواب محسن الملک جیسے روشن دماغ فصیح و بلیغ، رائٹ آنریبل سید امیر علی جیسے برگزیدہ فرزند ہند و ممتاز مقنن، مولوی نذیر احمد صاحب جیسے جید عالم، نواب عماد الملک جیسے فاضل و اہل الرائے اور ہمارے پنجاب کے فخر قوم آنریبل مسٹر شاہ دین جیسے ممتاز جج کی فصاحت و بلاغت سے گونجتا رہا ہے بلا اظہار تصنع مشکل سے اس شخص کے لئے جگہ ہو سکتی ہے جس کی مصروفیاتِ زندگی ایک دوسرے دائرہ اور ایک مختلف احاطہ میں رہی ہوں جب اُن معیاروں کا خیال کیا جاوے جن کی بنا پر آپ کے بہت سے صدر نشیں منتخب کئے جا چکے ہیں، جن میں سے صرف چند کا میں نے نام لیا ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کا یہ انتخاب کوئی خوش گوار انتخاب نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں بھی کالج کا ایک ٹرسٹی ہوں اور میرا تعلق کبھی کسی زمانہ میں کسی نہ کسی طرح پر تعلیمی تحریکات سے رہا ہے لیکن نفس الامر میں میرا تعلق پبلک لائف سے نسبتاً ممتاز طرز کا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ حضرات نے یہ خیال کیا ہو کہ ایک ایسے شخص کے خیالات و آرا کو معلوم کریں جو آپ کے حلقہ سے باہر کا ہو، اور میرا گمان ہے کہ آپ کا یہ انتخاب ممکن ہے کہ کسی جدید اور غیر معمولی توجہ اور لحاظ کی بنا پر ہوا ہو، اور آپ کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ ایک تماشائی یا اکھاڑے سے باہر کا شخص بسا اوقات اُس شخص سے بہتر طور پر کھیل کا اندازہ لگا سکتا ہے جو خود کھیل میں شامل ہو۔

صاحبان! اگر آپ کا ایسا ہی خیال ہو تو میں اس عزت افزائی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جو آپ نے اپنی انجمن کا صدر نشیں منتخب کر کے مجھے بخشی ہے گو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس ذمہ داری کے بوجھ سے میں دبا جاتا ہوں جو قدرتاً مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

بالیقین میں اس کو ایک اعلیٰ اعزاز تصور کرتا ہوں کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت قبول کرنے کے لئے مجھ سے ارشاد کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے میں یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی اس جگہ، کم از کم اس حیثیت میں، حاضر نہ ہوتا اگر مجھے گزشتہ تجربہ کی بنا پر یہ معلوم نہ ہوتا کہ مسلمان سامعین ایک ایسے شخص کی تقریر کو کس تلطف آمیز طریقہ سے سنتے ہیں جس کی دماغی قابلیتیں خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہوں لیکن یقین جانئے کہ اس کے دل میں ملک اور قوم کے مشترکہ مقصد کو محسوس کرنے میں اُن حضرات میں سے کسی سے کم تڑپ نہیں ہے جن کے اسمائے گرامی اس طولانی اور ممتاز فہرست میں شامل ہیں جنھوں نے گزشتہ مواقع پر آپ کے اجلاسوں کی کارروائی کی رہنمائی کی ہے۔

اکابرین قوم کا اثر افسوس ہے کہ اُن اکابر میں سے جو مسلمانان ہند کی شاہ راہ تیار کرنے والے اور "صد ہا قرون کے معلمین" تھے ہم سے جدا ہو گئے۔ لیکن اُن کا اقتدار اب تک قائم ہے اور عرصہ دراز تک قائم رہے گا، تاکہ منازل الحیات میں وہ ہماری رہنمائی کرے، ہمیں روشنی بخشے اور ہماری ہمت افزائی کرے۔ داغ بیلیں جو وہ لگا گئے ہیں اور یادگاریں جو چھوڑ گئے ہیں بکثرت ہمارے سامنے موجود ہیں اور اُن سے اُن کی ذکاوت اور ذہانت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

جنگ اے حضرات! ہم آج ایسے زمانہ میں مجتمع ہوئے ہیں جب کہ ہمارے سروں پر ایک مصیبت کبریٰ کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ جنگ جو یورپ میں ہو رہی ہے وہ بلاشبہ ایسی خوفناک ہے کہ جس کی نظیر تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتی۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم لفظ "تہذیب و تمدن" سے موسوم کرنے کا اشتیاق رکھتے ہیں وہ ایسی کم زور و ناطاقت شے ہے کہ وہ اُس جوع الارض کے طوفان اور حملوں کو نہیں روک سکتی جو ازمنۂ ماضیہ میں کسی نہ کسی شکل میں تباہ کن جنگوں اور حملوں کا باعث ہوا کرتی تھی۔ نہ تو اس کا یہ موقع ہے اور نہ وقت کہ اُن اسباب پر پوری پوری بحث کی جاوے جو اس جنگ کا باعث ہوئے ہیں۔ یہ اسباب نہایت کثیر اور مختلف النوع ہیں، اور میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ ایک تعلیمی مجلس ہرگز ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ان کے متعلق کوئی مطول و مبسوط بحث کی جا سکے۔ لیکن بحیثیت ایک ایسے شخص کے جس نے قدیم طرز کی روایات میں پرورش پائی ہو میں اپنی اُس رائے کے اظہار کی جرأت کرنا چاہوں گا جس کو میں ایسے گہرے یقین اور عمیق اعتقاد کے ساتھ محسوس کرتا ہوں

جو حد بیان سے باہر ہے کہ زمانۂ حال کی تہذیب کی سب سے بڑی خرابیاں اس کی "مادیت" کے عنصر
کا غلبہ اور تمام دیگر خیالات پر مطلب پرستی کے قابل اعتراض عقیدے کو ترجیح دینا ہے۔
ہر ایک تعلیمی تحریک کی پائیداری اس کی مذہبی رنگت ہے۔ ہمارے سادہ شرقی خیال کے
مطابق کوئی تعلیم مکمل نہیں ہوتی ہے تا وقتیکہ اس کی بنیاد انسان کے عقائد مذہبی پر نہ رکھی گئی ہو
معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں لوگ مادہ پرستی کی طرف اندھا دُھند اور بے بس ہو کر
دوڑ پڑے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس بات سے مدبران شرق و مغرب ڈرتے اور خوف
کھاتے تھے آخر کار وہی پیش آئی اور آتش جنگ نے خوفناک طور پر افروختہ ہو کر خدائی
زمین کی لہلہاتی بہار کو تہس نہس کر دیا۔ گویا معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسیح کے اُس روایتی ہزار
سالہ زمانہ سے جس کو انگریزی شاعر نے ذیل کے دو مصرعوں میں ظاہر کیا ہے اسی قدر بعید
ہیں جتنے کہ پہلے کبھی تھے ؎

"جبکہ مجلس بنی نوع انسان اور تمام عالم کے اتحادی دربار میں جنگ و جدل کے علم لپیٹ دئے
جائیں گے"

لیکن اس امر کے تسلیم کرنے میں کلام نہیں ہو سکتا کہ اس عظیم الشان تباہی و بربادی کا
حقیقی باعث جرمنی کا اصول "جنگ پرستی" ہے اور لاکھوں بنی نوع انسان کی زندگیوں کی
بے رحمانہ تباہی و قتل و غارت گری کی ذمہ داری خدا اور بندوں کے سامنے صرف جرمنی
ہی پر ہے۔ انگلستان کو اگر اس خوفناک غارت گری میں شرکت کرنا پڑی ہے تو اپنے تحفظ
حقوق کے لئے اور اس لئے کہ اپنے روایات قدیمہ کی بنا پر اس کو کمزوروں کی حمایت میں
جنگ کرنا اور بنی نوع انسان کے مقصد انصاف کی پشت پناہی کرنا ہے۔

انگلستان کا مقصد مبنی بر انصاف تھا

بدقسمتی سے اس مصیبت (جنگ) نے ایک مختلف شکل اختیار کی ہے کہ
ٹرکی نے ناعاقبت اندیشانہ طور سے اپنی قسمت جرمنی و آسٹریا کے ساتھ
وابستہ کر دی ہے جو انگلستان اور اُس کے حلیفوں کے ساتھ برسر پیکار ہیں۔

صاحبو! اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ یہ معاملہ نہایت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے اور مسلمانان ہند
کے لئے یہ موقع نہایت آزمایش کا ہے۔ لارڈ ہارڈنگ بالقابہ جیسے ممتاز مدبر کی فہم و ذکا قابل
ستایش ہے جن کے دست مبارک میں اس وقت ہندوستان کی زمام حکومت ہے اور جنھوں نے
ہمیں یہ یقین دلایا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ وقوع میں آئے انگلستان اور اس کے اتحادی

اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کے احترام پر نگاہ رکھیں گے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اس یقین دلانے نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے میں بڑا کام کیا ہے اور مسلمانوں کو اس روش پر قائم رکھنے کے قابل بنا دیا ہے جو موجودہ حالت میں صرف ایک ہی صحیح روش ہے۔ میرا مدعا سلطنت برطانیہ کی مستحکم وفاداری اور جاں نثاری کی روش سے ہی۔

سلطنت برطانیہ کے ساتھ ہماری وفاداری کی بنیاد

صاحبان! مجھے یقین ہے کہ کسی متنفس کو بھی ایک لمحہ کے لئے اس میں کلام نہ ہوگا کہ ہم حضور ملک معظم قیصر ہند کی زیر حکومت بکمال امن وامان رہتے اور محفوظ زندگی بسر کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اپنے مذہبی رسوم کی ادائیگی میں، جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے، کوئی رکاوٹ یا مزاحمت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا یہ سب سے مقدم فرض ہے کہ ہم تاجِ برطانیہ کے ساتھ ایسی روش اختیار کریں جو ہماری غیر متزلزل اور لاجنبش فاشعاری پر مبنی ہو۔

اے حضرات! مجھے یقین ہے کہ ہم سب کو اس بات پر فخر ہی کہ اپنی سلطنت کی حفاظت جیسے مقصدِ نیک میں ہماری ہندوستانی افواج اپنا مناسب حصہ لے رہی ہیں اور یوروپ کے میدان جنگ میں اپنی شجاعت بُردباری اور جاں نثاری سے یہ ثابت کر رہی ہیں کہ ہمارا اور انگلستان کا مقصد واحد ہی۔ تاربرقیوں کے مختصر خلاصوں پر لحاظ کرتے ہوئے میرے خیال میں اس بات کے اظہار کے لئے کسی پیشین گوئی کی ضرورت نہیں ہے کہ خاتمہ جنگ یعنی امن وامان کا حصول کچھ بعید نہیں ہے۔ جرمنی کے جنگی دم خم کی کمر کم از کم اُس وقت سے ٹوٹ گئی ہے جب کہ اُس کو پیرس کی طرف سے پیچھے ہٹ جانا پڑا، اور گو ابھی وہ وقت دور ہے کہ ہم کو ان مشکلات سے نجات ملے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اتحادیوں کی متفقہ افواج نے اگر اسی طرح چند اور شکستیں دیں تو یورپ میں امن وامان پھر قائم ہو جاوے گا۔ موجودہ حالت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم تاج برطانیہ کے وفادار رہیں اور اس مقصدِ نیک کے حصول میں جو انگلستان کا ہے تمام امکانی خدمات سے دریغ نہ کریں۔

مجالس تعلیمی کی قدر وقیمت

صاحبان! میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں کہ عجلت پسند نکتہ چیں یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ آخر کانفرنسوں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور ان کانفرنسوں نے مسلمانوں کی یا مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کیا خدمت انجام دی ہے؟ صاحبان! تعلیم ایک پودا ہے جو آہستہ آہستہ بڑھتا ہے کسی مشین یا کل کی تیز رفتاری کی طرح سے اس کے نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی اور نہ بارود کی سی تیزی پر اس کے

نتائج کا قیاس ہو سکتا ہے کہ ادھر آگ دکھائی اور اُدھر بارود نے دھواں دے دیا۔ اس کے لئے اول ضرورت ہے پھاوڑے اور کدال سے بہت کچھ کام لینے کی کالجوں اسکولوں اور وظائف کے بہت کچھ کھاد ڈالنے اور تخم ریزی کرنے کی اور زمانہ دراز کے گڑے ہوئے تعصبات کی ناکارہ گھاس کے نرانے کی تب جاکر کہیں ہم کو اپنی محنت و جانفشانی کے پھلوں کے دیکھنے کی توقع کرنا چاہئے۔ جو حضرات اُن تعلیمی رپورٹوں کے مطالعہ کی تکلیف گوارا کریں گے جو مختلف مقامی گورنمنٹوں نے شائع کی ہیں میں اُمید رکھتا ہوں کہ وہ اس امر کو معلوم کریں گے کہ تعلیم نے بڑی حد تک ترقی کی ہے۔ لیکن اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جاوے حالانکہ اعداد و شمار کے موجود ہوتے ہوئے یہ نہیں تسلیم کیا جاسکتا کہ تعلیم میں کوئی قابل لحاظ اور قابل پسند ترقی نہیں ہوئی تب بھی مجھکو یہ تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہیں ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس نے جس کے لئے اس کے بانی کی فہم وذکا قابل ستائش و شکریہ ہے کم از کم اُن تعصبات کے جڑھ سے اُکھیڑنے میں کامیابی حاصل کی ہے جو اُس دماغی تنگ دوو کے حق میں مخالف رہے ہیں جس کی دور اندیش پیشگو اور تخیر بنشک نے بنیاد ڈالی تھی۔ اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ اگر کانفرنس نے اس کے سوا کچھ اور کام نہ بھی کیا ہو تب بھی اُس نے مسلمانان ہند کے ممنون اور محبت بھرے دلوں میں اپنے بانی کی اور اُن لوگوں کی یاد کو جاگزیں کر دیا ہے جنھوں نے بعد میں اس کی ترقی کے لئے سعی کی۔

مسلمانوں کا اخلاقی معیار

صاحبان! میں اب ایک مناسب حال مضمون کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو بادی النظر میں اگر مایوس کن معلوم ہو تو آپ مجھے معاف کریں گے۔ اخلاق اور تعلیم کے درمیان میرے خیال میں کوئی نمایاں تفریق کبھی نہیں کی گئی ایک شے دوسری پر موثر ہے اور پھر یہ دونوں خاص انحصار باہمی کی وجہ سے ایسے اجزا پیدا کرتے ہیں جن سے قومی وقار اور قومی خصوصیات بنتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک طرف نصف صدی کے جمود، تساہل اور تذبذب نے اور دوسری طرف تعصبات نے مسلمانانِ ہند کی جماعت کو پراگندہ و منتشر کرنے میں مدد دی ہو لیکن یہ صرف وہ امور ہیں جن سے اس حالت کی تشریح ہو سکتی ہے کہ کس طرح اُس قوم کی اولاد کو جو کسی زمانہ میں شاہی دہلی کی پرشوکت درباروں پر برسر حکومت تھی آج ہندوستان کی صف پائین میں جگہ ملی یا اب اس وقت اس کا یہ درجہ ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ مسلمانان ہند کا اخلاقی معیار بالعموم انحطاط کی طرف رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ کسی قوم کی خصوصیات علی العموم اس کے علم ادب میں منعکس ہوتی ہیں یعنی اُس علم ادب میں جو غیر کا نہ ہو بلکہ خود اسی قوم کا ہو۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ شاعری میں نمک مرچ بھی لگایا جاتا ہے لیکن شعرا کی قابلیت کا کافی لحاظ رکھتے ہوئے بھی اس امر واقعہ کی طرف سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اگر نظم تہذیب اخلاق کے بجائے صرف تفریح کا سامان ہی مہیا کر سکتی ہو تو ایک قوم کے ادبیات کی اعلیٰ ترین غرض مفقود ہو جاتی ہے اور وہی نظم جو روزانہ زندگی کے بے شمار حقایق پر مشتمل ہے اور جیسے قوم کے اقتصادی و عملی حصۂ حیات پر عظیم الشان اثر حاصل ہے، بے سود ثابت ہوتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نظم کی توہین نہیں کرنا چاہتا لیکن نظم سے میری مراد وہ مقدس نظم ہے جو براہ راست ہمارے قلوب پر اثر ڈالتی ہے اور ہمیں عوام کالانعام کے دائرہ سے نکال کر روحانی بلندی کی طرف لیجاتی ہے۔ بیاری یا اندوہ کی حالت میں اگر ہمیں ایک شعر یا ایک معنی خیز فقرہ سُنا دیا جاوے تو ہم ایک تازگی اور بشاشت محسوس کرتے ہیں لیکن اخلاقی یا روحانی ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے ایسے مادّی درجات مقرر نہیں ہیں جیسے ایک ظاہری حرکت کے اندازہ کے لئے ہو سکتے ہیں اور نہ یہ ترقی سطحی تازگی اور خوشی کی بنا پر متمیز ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس روحانی ترقی کا امتیاز صرف تبدیل ہیئت سے ہو سکتا ہے جس کی واضح مثال کے لئے میں آپ کو ایک انڈے کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ وہ رفتہ رفتہ ایک کیڑا بن جاتا ہے اور کچھ مدت کے بعد پر و بال نکال کر اڑنے لگتا ہے۔ جو نظم اس قسم کا روحانی اثر نہ پیدا کر سکے وہ میرے نزدیک محض وقت اور قابلیت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ نظم کو انسانی طبیعت میں بڑا دخل حاصل ہے۔ وہ قلوب کو جس سانچے میں چاہے ڈھال سکتی ہے، خیالات میں بلندی پیدا کر سکتی ہے اور انسان کو مادّی خودغرضی سے نجات دلا سکتی ہے اور جب اُس کا نصب العین درست ہو تو یہ اعلیٰ ترین طاقت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن بخلاف اس سے مقصود صرف یہ ہو کہ چند کوتاہ بین و پست خیال لوگ تھوڑے عرصہ کے لئے اس کی تعریف و توصیف کے نعرے لگائیں تو یہ یقیناً ایک مجسم بدی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بعض اوقات مضمون واحد پر کچھ شعرا کے خیالات جاں کاہ عتوں کے اخلاقی تنزل کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے مسلمانانِ ہند کی کمزوریوں پر ہمیشہ غور کیا ہے اور میرے نزدیک اُن کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اُن میں "عزتِ نفس" کا مادّہ نہیں رہا۔ "قولِ مرداں جان دارد" سے زیادہ ترقی پر اُبھارنے والا اور کوئی مطمح نظر نہیں ہو سکتا۔ میں بوثوق کہتا ہوں کہ جب تک مسلمانانِ ہند اس دستورالعمل پر کاربند تھے ہر قوم اُن کی عزت کرتی تھی اور وہ ہر قسم کی نیکی و شرافت کے مظہر تھے لیکن بعد میں جب اُن کے اس اعتقاد میں تزلزل

پیدا ہوگیا تو اُن پر ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں۔ پہلے تو وہ "قول مرداں جاں دارد" کے معتقد تھے لیکن اس کے بعد اُن کے اعتقاد میں جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ اس مصرعہ سے ظاہر ہوتی ہے ؎

"وعدہ آسان ہے وعدہ کی وفا مشکل ہے"

یہ مصرعہ ایک بیّن انقلاب کا مظہر ہے لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت اور اختصار کے ساتھ یہ تبدیلی ذیل کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے جو یہ ہیں کہ: ؎

"وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا"

حضرات! میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس انقلاب پر ادبی پہلو سے کامل بحث کی جاوے اور ان فقرات کو مسلمانانِ ہند کے انحطاط و تنزل کے مختلف درجات کا قطعی مظہر قرار دیا جاوے لیکن میرا اعتقاد ہے کہ اگر کسی قوم کے خیالات کا اندازہ اُس کی نظم، اُس کی ادبیات اور روزانہ زندگی کے اعمال سے ہوسکتا ہے تو ان مصرعوں سے اُس مردانگی اور خودداری کے تنزل اور انحطاط کا پتہ چلتا ہے جس نے قرون اولٰے میں ہمارے آبا و اجداد کو امتیاز بخشا تھا اور احساس فرض کا آلہ ہونے کی حیثیت سے جس کی بنیاد مذہبی تربیت یافتہ قلوب میں بڑے استحکام سے قایم تھی۔ مذہبی تربیت اخلاقی جرأت کے حصول پر اُبھارتی ہے اور اخلاقی جرأت و خودداری۔ عزت نفس کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ جن اُردو مصرعوں کا میں پہلے ذکر کرچکا ہوں اُن کا قرآن کریم کی اس آیتہ سے مقابلہ کرو۔

واوفوا بالعهد إن العهد كان مسؤلا

یقین کیجئے کہ ہمارے نصف مصائب کا باعث متانت و عزت نفس کا نقدان ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ صفات ہیں جو تمام اوصافِ حسنہ اور ہمدردی بنی نوع کی جڑ ہیں۔ بے شبہ یہ صفات اس شریف حب وطن کا سرچشمہ ہیں جو ایک جماعت میں قوت تحریک پیدا کرتی ہے اور اس کے خیالات کو بلند بنا دیتی ہے اور جس پر کاربند ہوکر لوگ مردانہ وار اپنے فرائض ادا کرتے اور دیانت و متانت اور انصاف کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے حقداروں کی ترقی کے لئے تمام اُن مواقع سے جو اُنھیں حاصل ہوں پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اوصاف ہیں اُن بزرگوں کی مثال اور یاد تازہ رکھنے کے قابل بناتے

ہیں جو اگرچہ اب دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن وہ ایک ایسا زبردست اثر اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ وہ ایک لازوال میراث ہے جس کا اثر ہر شے میں جلوہ افگن ہے اور ہمارے لئے نشانِ قدم کا کام دیتی ہے۔ یہ ہماری اور خود اسلام کی خوش قسمتی ہے کہ مسلمانوں میں اپنی اصلی حیثیت کو سمجھنے کا میلان پیدا ہو رہا ہے اور یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ اب تمام اقطاعِ ہند کے مسلمان متحدہ طاقت سے نہ صرف خرابیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں بلکہ اُس نقصان کی تلافی کے لئے کوشاں ہیں جو گزشتہ نصف صدی میں اُنھیں پہنچا ہے اس بیداری کی بیّن علامت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود ہے جو زندۂ جاوید سرسید کی قابلیت اور دور اندیشی سے معرض وجود میں آئی اور اسی کے ساتھ شعبۂ نظم کی وہ مخصوص ترقی ہے جو علی گڑھ تحریک کے دوش بدوش شروع ہوئی اور جس کے بانی مولانا خواجہ الطاف حسین صاحبؒ حالی جیسے بزرگ ہیں۔

تعلیمی عقدہ ہنوز حل طلب ہے

حضرات! مسئلۂ تعلیم ایک نہایت وسیع الحدود مسئلہ ہے۔ تعلیم کی نوعیت اور طریق تعلیم یہ دونوں ایسے سوال ہیں جو ترقی یافتہ مغرب میں بھی کوئی قطعی صورت اختیار نہیں کر سکے۔ اس حیران کن عقدہ پر فضلا و ماہرین سیاست نے بہت کچھ بحث کی ہے۔ بے شمار نقاد موجودہ طریق کو قابلِ تنسیخ قرار دے چکے ہیں اور ایک کثیر التعداد گروہ ایسا بھی ہے جو اسے اب تک تھامے ہوئے ہے اور جس کے خیال میں یہ بہترین اور موافق ترین طریق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اکثر ماہرینِ فن کی یہ رائے ہے کہ آئندہ تعلیم میں مذہبی اور اخلاقی پہلو غالب رہنا چاہئے اور اس میں یہ خصوصیت نمایاں ہونی چاہئے کہ وہ عملی زندگی کی ضروریات کے موافق ہو۔ اس اختلاف آرا نے ایک بحث کی صورت پیدا کر دی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ اب تک بھی کوئی ایسا طریق متیقن نہیں ہو سکا جس کے مطابق آئندہ تعلیم کی نوعیت کا فیصلہ کیا جا سکے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ہماری قوم کے لئے جسے غربت یا افلاس یا ایک ایسی حالت نے جو سیاسی تنزل کے بعد ظہور پذیر ہوا کرتی ہے بڑی سختی سے دبا رکھا ہے۔ مختلف تعلیمی اصولوں کا عملی تجربہ یا جدید اور غیر آزمودہ طریقوں کا اجرا ایک ایسی بدعنوانی ہوگی جس کے بدنتائج کی وہ کسی صورت میں بھی تاب نہیں لا سکتی۔

ہم کو مقررشدہ دستور العمل پر عامل ہونا لازم ہے

ہمیں لازم ہے کہ تمام مقاصد و اغراض کے لئے اُسی دستور العمل پر چلیں جو مقرر شدہ ہے، اُس میں صرف اُسی قدر ترمیمات کر لیں

جو ہماری قوم کی خاص ضروریات کے مناسب حال ہوں۔ میرے اس بیان سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ گورنمنٹ کی پالیسی تعلیم کے متعلق درست اور راسخ ہے یا یہ کہ ہم کو پیش وپس کا کچھ لحاظ نہ رکھنا چاہیئے اور یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے ہم پر کیا اثر کیا ہے۔ میرے خیال میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کا لب لباب صاف طور سے اُن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جو انڈین ایجوکیشنل پالیسی (مطبوعہ گورنمنٹ آف انڈیا ۱۹۰۴ء) سے میں اخذ کرتا ہوں:-

> "طریقۂ تعلیم میں جس کا اس طرح رواج دیا گیا ہے اُن تمام دماغی ترقیات کے لئے جو ایک مہذب قوم کے شایانِ شان ہوں، مختلف مدارج کے لحاظ سے سامان موجود ہے۔ اس سے تعلیم تفحص (ریسرچ) کے متعلق طلباء کی تمام خواہشات قابلِ اطمینان طور پر پوری ہوتی ہیں۔ اس سے گورنمنٹ کے لئے متدین اور ہوشیار ملازم بہم پہنچتے ہیں۔ اس سے ایسے کاریگر تیار ہوتے ہیں جو ہر ایک شعبہ تجارت کے لئے جو ہندوستان میں مستحکم طور پر قایم ہو گئی ہے کارآمد ہوتے ہیں۔ اس سے ملک کے ذرائع ترقی کو امداد پہنچتی ہے اور فنونِ لطیفہ اور صنعت و حرفت کو ترقی ہوتی ہے۔ اس سے ملک کی ہر ایک جماعت کو اُن کی ضروریاتِ زندگی کے مناسب حال تعلیم ہوتی ہے، اور ان اغراض کے حصول کے لئے یہ طریق تعلیم ایسے طور پر مدوّن کیا گیا ہے جس سے تعلیم غیر محدود طور پر پھیل سکتی ہے کیونکہ تعلیم کی مانگ بڑھتی جاتی ہے اور حکومت اور پبلک کی طرف سے ایک بڑے پیمانے پر فیاضانہ امداد ملتی جاتی ہے۔"

یہ پالیسی جناب گورنر جنرل با جلاس کونسل نے ۱۹۰۴ء میں ظاہر کی تھی، اور یہی پالیسی آج کے دن تک چلی آتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کی پالیسی جہاں تک کہ وہ خاص مختص ضروریات پر مؤثر ہے، سخت و درشت نہیں ہے۔

مذہبی تعلیم | یہ صاف عیاں ہے کہ گورنمنٹ بھی اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ اُس کی پالیسی "غیر محدود وسعت" کی محتاج ہے۔ بعض بڑے بڑے اصول کے لحاظ سے البتہ ہم کو اس عام طرز تعلیم کے ساتھ ساتھ چلنا پڑے گا جو ہندوستان میں مروج ہے لیکن اس سے ہمیں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم اس کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیں جس سے کسی ایسی قوم کی ضروریات پوری ہو کر

جس کے مذہبی اور اخلاقی خیالات کی بنا اس کی قدیمی روایاتِ قومی پر ہو اور وہی اس کی بہترین پونجی ہو۔ میرا اعتقاد ہے کہ یہ ایک دستور ہو گیا ہے کہ جو شخص اس بات پر زور دیتا ہے کہ طریقۂ تعلیم میں مذہبی تعلیم کو ممتاز درجہ اور اونچی جگہ ملنا چاہئے اس پر خوب لے دے کی جاتی ہے۔ ایک ایسے زمانہ میں جیسا کہ زمانۂ موجودہ ہے جس میں فیشن اور دستور کے شور و شغب سے لوگوں کا اکثر ناک میں دم کیا جاتا ہے مجھے شک ہے کہ کہیں میرے اُن مذہبی خیالات پر جو میں نے ظاہر کئے ہیں یہ فتویٰ تو نہیں لگا دیا جائے گا کہ یہ ایک ملا آدمی کے خیالات ہیں یا ایسے خیالات ہیں جن میں دیوانگی کا اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانِ ہند کے اوجِ ترقی پر پہنچانے کے متعلق آپ کے کچھ ہی خیالات کیوں نہ ہوں اور اس کے متعلق آپ کی تجاویز کچھ ہی قرار کیوں نہ دی گئی ہوں مجھے یہ عرض کرنے میں کچھ بھی تامل نہیں ہے اور میں نہایت زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہم بہترین عملی انسان اور بہترین فرد قوم اور عظیم الشان سلطنت کے بہترین شہری اُسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ ہمیں اُس تعلیم کے ساتھ ساتھ جو سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ مذہبی تعلیم و تربیت بھی کافی طور پر دی جاوے۔ میری تو یہ قطعی رائے ہے کہ قومی ذہنی کی تعلیم و تربیت جو مذہب سے معرّا ہو یا زیادہ صحت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تعلیم جس کا باگ مذہب کے ہات میں نہ ہو وہ زیادہ سے زیادہ ایک قابل اعتراض ذہانت و جودت طبع پیدا کرتی ہے۔ تعلیم جو مذہب سے معرّا ہو وہ ایسے آدمی پیدا کرتی ہے جو ذہانت کے پہلوان کہلاتے ہیں۔ جس شخص کو اچھی طور سے مذہبی تعلیم دی گئی ہو خواہ وہ کسی فرقہ کا آدمی ہو (کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ تمام مذاہب کے بنیادی اصول جو اچھے طریقے سے سکھلائے گئے ہوں حقیقتاً ایک ہی ہوتے ہیں) وہ ایک ایسا فرد ہوتا ہے جس کے اندر ایک ایسی طاقت کام کرنے والی ہوتی ہے جو اُس کے قلب پر حکمرانی کرتی ہے جو نیک خیالات، صالح ایمان اور نیک زندگی بسر کرنے کی تحریک کی قوت کا منبع ہے۔ اور یہی وہ کارکن طاقت و قوت تھی جو گزشتہ صدیوں میں شہرآفاق بہادرانِ اسلام میں جاری و ساری تھی۔ یہی وہ چیز تھی جس نے جاں نثارانِ پیغمبر علیہ السلام اور علَم بردارانِ اسلام کو ہر بات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے ہر مصیبت کو برداشت کرنے اور ہر طرح کا ایثار کرنے اور اپنے فرض کی انجام دہی میں مذبذب نہ ہونے کے قابل بنا دیا تھا، اور یہی وہ زبردست مذہبی اور اخلاقی جذبہ ہے جس کی بدولت پیروانِ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام عام انسانی گروہ سے بڑھ کر ممتاز نظر آتے ہیں اور جب ہم ان کے سوانح اور حالاتِ زندگی پڑھتے ہیں تو اپنے آپ کو ان کے

مقابلہ میں ایسے پست درجہ پر پاتے ہیں کہ ہمارا خون خشک ہوتا ہے، دل بیٹھ جاتا ہے اور اعضا میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہم کو سرتاسر ایسی خوبیوں اور اوصاف سے متصف نظر آتے ہیں جو کسی قوم کے فخر اور افتخار و اعزاز کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ مثل منور اور روشن تاروں کے ہر زمانے اور ہر وقت میں تاباں اور درخشاں رہیں گے۔ ان کے کارناموں کی تابانی سے تاریخ کے صفحات منور ہیں اور ہم کو اس امر کا پرزور احساس دلاتے ہیں کہ ایک زمانہ میں اُن کا وجود تھا اور وہ جامۂ حیات میں تھے۔ کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی معقولیت کے ساتھ اس امر کا ادعا نہیں کر سکتا کہ علوم مشرقیہ اور مذہبی تربیت کی کافی استعداد لائق اور شائستہ افراد پیدا کرنے سے قاصر ہوگی۔ دور کیوں جاتے ہو۔ آپ تسلیم کریں گے کہ سر سید احمد، نواب وقار الملک اور ایسے ہی دیگر بزرگوں نے آپ کی یونی ورسٹی سے کوئی استفادہ حاصل نہیں کیا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ کسی کو اس میں کلام نہ ہوگا کہ یہ لوگ عام انسانوں سے بالاتر ہیں۔ اور ایسے بالاتر کہ جو اپنی شخصیت اور قوت کے نشان ہماری جماعت کے اخلاق پر چھوڑ گئے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کی تعلیم کس قسم کی ہوئی تھی، محض قومی تعلیم یا زیادہ صحت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خالص مشرقی تعلیم، اور اگرچہ ان کو بجا طور سے ذہانت اور قوت دماغی کے لحاظ سے عام انسانوں سے بالاتر درجہ دیا جاتا ہے مگر اُن کی تعلیم و تربیت کی بنیاد عربی و فارسی ہی پر تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے بعض حضرات مجھکو اس فلسفیانہ معمے سے خاموش کرنا چاہیں گے کہ وہ لوگ زمانہ کے ارتقا کا نتیجہ تھے، لیکن میں عرض کروں گا کہ اُن کی ذہانت و فطانت کی عمارت کی بنیاد میں مشرقی تعلیم اور محض مشرقی تعلیم ہی تھی۔

حضرات! میں اس موقع پر زمانۂ حال کی تعلیم کے برخلاف وعظ نہیں کہتا۔ مجھ کو مغربی تعلیم کے فوائد کا بخوبی احساس ہے حقیقت یہ ہے کہ ممکن نہ تھا کہ بغیر مغربی تعلیم و تہذیب کے مسلمانانِ ہند اپنے تنزل و انحطاط کی روک تھام کر سکتے، جس میں وہ اُن تعصبات اور ضعیف الاعتقادی کی بدولت گرتے چلے جا رہے تھے جو اُن کی سیاسی قوت کے جاتے رہنے سے اُن میں پیدا ہو گئے تھے اور جو اُن کی جماعت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح برباد کر رہے تھے میرا درحقیقت یہ اعتقاد ہے اور اس میں تخالف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر ہم بحیثیت قوم کے چاہتے ہیں کہ زندگی کی تگ و دو میں دیگر اقوام کے مقابل اپنی ہستی کو قایم و برقرار رکھیں تو ہمارے نظام تعلیمی میں زمانہ موجودہ کی تعلیم و تربیت کو اول جگہ ملنا چاہئے۔ لیکن میں عرض کروں گا اور پورے اعتقاد کی بنا پر عرض کروں گا کہ من حیث القوم ہم اپنی شخصیت و جداگانہ حیثیت کو کھو بیٹھیں گے اگر

ہم نے اس ضروری مغربی تعلیم و تربیت کے ساتھ اپنی مذہبی تعلیم کو جس کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہے کافی طور سے باہم آمیزش نہ کی، ظاہر ہے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں ہم کو کوئی ایسی تعلیم جو مذہبی ہو نہیں مل سکتی لیکن مجھے اس امر کا کامل یقین ہے کہ خود ہمارے قومی کالجوں اور اسکولوں میں ہمارے لئے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم اس کو بہترین شکل میں نہ مہیا کر سکیں، اور اس موقع پر میں اپنا دلی خیال آپ کو بتاتا ہوں، یعنی اُس شخص کا دلی خیال جس نے پرانی روایات کی بنا پر تعلیم پائی ہے اور جو زمانہ حال کی تہذیب و شائستگی سے بھی کوئی بغض و عناد نہیں رکھتا کہ اگر اس خصوص میں آپ کی مجوزہ یونی ورسٹی انتظام کرنے سے قاصر رہے گی تو وہ اپنے اس حقیقی مطلب و مدعا میں ناکام رہے گی جس کی بدولت وہ قوم کی نظروں میں ہر دلعزیز، مفید اور تمام قوم کے لئے فائدہ رساں اور عملی کام کرنے والی ثابت ہوگی، مزید برآں میں عرض کروں گا کہ آپ کی مجوزہ یونی ورسٹی کی مشرقی تعلیم کا پہلو نہایت مستحکم اور مضبوط ہونا چاہئے اور عربی تعلیم و دینیات کی ڈگری کے لئے وسیع سہولتیں اور سامان مہیا ہونے چاہئیں۔

تعلیم عربیہ بمقابلہ فارسیہ

میں عربی علم ادب کو پیروان اسلام کی تعلیم کے حق میں نہایت قیمتی خیال کرتا ہوں اور میں اس کو فارسی پر جو مغلوں کی حکومت میں عدالتی زبان تھی قطعی طور سے ترجیح دیتا ہوں۔ شاہان مغلیہ کے وقت میں ہماری کتب دینی اور دینیات کا علم فارسی زبان میں نہیں تھا بلکہ عربی زبان میں تھا اور فارسی کی حیثیت اُس وقت وہی تھی جو اس وقت ہندوستان میں انگریزی زبان کی ہے، یعنی ملک کی عدالتی زبان۔ فارسی کا کام اب انگریزی نے لے لیا ہے اور اس لئے میری رائے ہے کہ اسے ترک کر دینا چاہئے اور عربی زبان کو اپنے نصاب تعلیم میں داخل کرنا چاہئے۔ مجھے اس امر سے انکار نہیں ہے کہ فارسی نے عربی کے اختلاط سے علم ادب پر بہت عمدہ اثر ڈالا ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے افراد انگریزی اور عربی کو پڑھیں اور کسی دوسری مشرقی زبان کا بوجھ نہ اٹھائیں، جس کے شمول سے زندگی کی دوڑ میں ہمارے لئے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں اس سوال پر بحث کرنے سے کہ قوم کو مذہب کی اور عربی کی تعلیم کے لئے کن ذرائع اور طریقوں کو اختیار کرنا چاہئے، بلا ضرورت آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تفصیلات ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جب مختلف شعبہ ہائے تعلیم کے نصاب کی اسکیمیں مدون ہونگی اُس وقت ان پر مناسب طور سے توجہ کی جائے گی۔ عربی اور مذہبی تعلیم کو ترقی دینے کے لئے

جو طریقے میرے ذہن میں آتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ دیسی مکاتب اور مدارس قرآنی کی توسیع کی جاوے۔ بنگال میں ڈاکٹر راس کی تحریک پر جو کئی سال سے کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل تھے اور اب آخر میں گورنمنٹ ہند کے ہوم ڈیپارٹمینٹ کے اسسٹنٹ سکرٹری ہیں، گورنمنٹ نے بڑے بڑے دیہات میں مکاتب و مدارس قرآنی کے اجرا کا کام کرنا شروع کیا ہے یہ انتظام فی الحال بطور آزمائش کے ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس کا انتظام عمدہ طریقے سے چلایا گیا اور گورنمنٹ کی طرف سے جو تقویت اور امداد مل رہی ہے وہ ملتی رہی تو اس سے مسلمانوں کی مذہب کی ابتدائی تعلیم کی اشاعت اور اُن کی قومی خصوصیات کی تقویت کے لئے عمدہ نتائج مترتب ہوں گے۔

ایک تندرست اور خود دار قوم بننے کی شرائط

حضرات! اگر میں نے مذہبی تعلیم کے متعلق لمبی چوڑی تقریر کی ہے تو محض اس وجہ سے کہ مجھے اس امر کا یقین واثق ہے کہ کسی قسم کی بھی تعلیم سے جو اس نام کی مصداق ہو آخر الامر وہ باتیں نہیں پیدا ہو سکتیں جو ایک قوم کو تندرست مضبوط اور خود دار بناتی ہیں۔ آپ صاحبوں کا جو کچھ بھی خیال ہو وہ ہو، میرا تو یہ خیال ہے کہ جس تعلیم میں مذہبی تعلیم شامل نہ ہو اس سے اعلیٰ صفات کے انسان پیدا نہیں ہو سکتے۔

چونکہ ایک دن ہماری اپنی یونی ورسٹی ہوگی، اس لئے میرے خیال میں یہ بے محل نہ ہوگا اگر میں چند الفاظ اُن موٹے موٹے اصولوں کے متعلق عرض کردوں جن پر یونی ورسٹی کو کاربند ہونا چاہئے۔ لنڈن ٹائمز کے ایک مضمون سے جو بظاہر ایسے شخص کے قلم سے معلوم ہوتا ہے جو ہندوستانی یونی ورسٹیوں کے نظام تعلیم کا ماہر ہے۔ میں حسب ذیل الفاظ کا اقتباس کرتا ہوں:۔

> خالص دماغی ذہانت کے نکتۂ خیال سے (اور اسی پر آج ہم بحث کرنا چاہتے ہیں) اگر ہندوستانی یونی ورسٹیوں کی حالت کا پورا معائنہ کیا جاوے تو نہایت تکلیف وہ ثابت ہوگا۔ اپنی خواندہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ یونیورسٹی گریجویٹوں کی اس تعداد سے بہت زیادہ تعداد رکھتا ہے۔ جو اس کی یا کسی دوسرے ملک کی ہے۔ لیکن اس پیداوار کی قابلیت اور سطح کے لحاظ سے افسوسناک طور پر پست ہے اور مستقل طور پر کم ہوتی جاتی ہے ......

فی الواقع بات یہ ہے کہ ایک طرف تو مصنوعی امتحانات نے ہندوستانی تعلیم کو جو یونیورسٹیوں

ہیں دیہاتی پر کامل طور سے غلبہ پالیا ہے اور نکما کر دیا ہے اور دوسری طرف کتب درسیہ نے جو طلبا کے قوت یادہی کو جانچتے ہیں نہ اُن کی ذہانت کو۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض طباع اور ذہین طالب علم اس غیر مفید اور سخت طریقہ تعلیم کے جکڑ بند توڑ کر اُبھر جاتے ہیں لیکن ایک کثیر تعداد "کتب درسیہ کی غلامی اور امتحانات کے جکڑ بندوں کا آہستہ آہستہ شکار ہو جاتے ہیں" مجھے اُمید ہے کہ ہماری یونی ورسٹی موجودا لوقت یونی ورسٹیوں کی اندھی تقلید نہیں کرے گی۔ اور جب اس کے مقاصد اور ضوابط کے تدوین کا وقت آئے گا تو موجودہ طریقے کے نقائص وعیوب کو فراموش نہیں کر دیا جائے گا۔

اعلیٰ تعلیم استحکام حاصل کر چکی ہے | یونی ورسٹی کا نظام تعلیم جس سے میری مراد اعلیٰ تعلیم سے ہے، خواہ وہ برا ہے یا بھلا اس ملک میں استحکام پکڑ چکا ہے۔ اس پر صرف خوردہ گیری کرنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ اس کے نقائص کا پتہ لگانے، اُس کی اصلاح کرنے، اُسے مضرات سے پاک کرنے اور تمدن وعلم کی حقیقی ضروریات کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ معاف فرمائیں گے اگر میں اصل مبحث سے کچھ تجاوز کروں۔ رسالوں اور عام اخبارات میں جو کچھ نکتہ چینی اعلیٰ تعلیم کے ناقص ہونے کے متعلق کی جاتی ہے اس سے بعض لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ گورنمنٹ اس ملک میں اعلیٰ تعلیم سے دست کش ہونے کا کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ گورنمنٹ نہ تو دست کش ہونا چاہتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ جب کہ ایک مرتبہ اُس نے ہمیں ذہنی وعقلی حیثیت سے مغرب کا حصہ دار بنا دیا ہے تو اس کا یہ مقدس فرض ہے کہ وہ ہمارے اس حق کو برقرار رکھے اور اسے وسعت دے۔ نہ کہ اس کو محو کر دے۔ لارڈ میکالے نے (جو اس زمانہ میں کونسل کے مشیر قانونی اور سررشتہ تعلیم کی مجلس کے صدر تھے) جو پالیسی ۱۸۳۵ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کے اپنے مشہور مراسلے میں اس پالیسی کو وسعت دی تھی جس میں اُنھوں نے اس فیصلہ کا اعلان کیا تھا کہ گورنمنٹ کو ہندوستان میں مغربی تعلیم کی وسیع اور باقاعدہ ترقی مستعدی کے ساتھ امداد دینا چاہئے۔ ۱۸۵۳ء میں لارڈ ڈلہوزی وائسرائے تھے اُس وقت سر چارلس ووڈ (جو بعد میں وائکونٹ ہیلفیکس کہلائے) ان کا مراسلہ ہندوستان کے لئے ایک تعلیمی اسکیم پر مشتمل موصول ہوا۔ اس مشہور مراسلہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"...... کثیر التعداد اہم معاملات میں سے کوئی معاملہ مسئلہ تعلیم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے یہ ہمارا ایک مقدس ترین فرض ہے کہ جہاں تک ہمارے امکان میں

ہے۔ ہم ہندوستان پر اُن کا کثیر اخلاقی اور مادی برکات کے نزول کا ذریعہ بن جائیں جو علوم نافعہ کی عام توسیع و اشاعت سے حاصل ہوتی ہیں اور جو ہندوستان انگلستان کے ساتھ اپنے تعلق سے حاصل کر سکتا ہے۔

اس سے ذرا آگے چل کر مراسلہ مذکور میں نہایت زور کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے کہ:-

جس تعلیم کو ہم ہندوستان میں وسعت دینا چاہتے ہیں اس کا مقصد ترقی یافتہ علوم و فنون، سائنس، فلسفہ اور ادبیات یورپ یا بالفاظ مختصر یورپین علوم کا پھیلانا ہے ......"

جب ملک کی عنان حکومت تاج برطانیہ کے ہاتھ میں آئی تو ۱۸۵۸ء میں اس پالیسی کی جس کی بنیاد وائکونٹ ہلیفیکس نے ۱۸۵۴ء میں ڈالی تھی دوبارہ توثیق کی گئی۔ میں آپ کو باور کراتا ہوں کہ اب اس پالیسی سے روگردانی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ برخلاف اس کے تعلیمی مصارف یوماً فیوماً زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ گزشتہ دس سال میں عام اخراجات چار کروڑ سے سات کروڑ تک بڑھ گئے ہیں۔ اس موقع پر مجھے یقین ہے کہ اُن الفاظ کے اعادہ کے لئے مجھے معافی مانگنے کی حاجت نہیں، جو ہز امپیریل مجسٹی حضور شاہنشاہ معظم نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایڈریس کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جنہوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں اُمید کی ایک برقی رَو دوڑا دی تھی، یہ الفاظ اعلیٰ دانش مندی، تدبر اور فیاضی پر مبنی ہیں اور یہ ایسے الفاظ ہیں جو ہر طالب ہندوستانی کو سونے کی تختی پر نقش کرا کے اپنے پاس رکھنے چاہئیں اور جو ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کا نشان امتیاز ہیں۔

شہنشاہِ معظم ہمارے تعلیمی مستقبل پر

ہز مجسٹی نے ارشاد فرمایا تھا:-

"فی زمانا کوئی یونیورسٹی مکمل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ علوم و فنون کے تمام اہم شعبوں کے متعلق تعلیمی فیکلٹیاں اور تحقیق و تدقیق کے پورے مواقع اس میں مہیا نہ ہوں۔ تمہیں علوم قدیمہ کو محفوظ رکھنا ہے اور اسی کے ساتھ مغربی علوم کو ترقی دینا ہے۔ تمہیں کیرکٹر (سیرت) بھی پیدا کرنا ہے جس کے بغیر تعلیم کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی تم کہتے ہو کہ تم اپنی عظیم الشان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہو۔ میں اس کام کے لئے جو تم کو درپیش ہے خدا سے کامیابی کی دعا مانگتا ہوں۔ اپنے مطمع نظر کو بلند رکھو اور ان کی مساعی تکمیل میں فرق نہ آنے دو اور خدا کے فضل و کرم

سے تم ضرور کامیاب ہو گے۔ چھ سال قبل میں نے انگلستان سے ہندوستان کو ایک پیغام ہمدردی بھیجا تھا اور آج ہندوستان میں موجود ہو کر میں تمھیں نوید اُمید دیتا ہوں۔ ہر طرف مجھے نئی زندگی کے آثار اور علامتیں دکھلائی دیتی ہیں تعلیم نے تمھارے دلوں میں اُمید پیدا کی ہے اور اعلیٰ اور بہتر تعلیم سے تم کو اعلیٰ و بہتر اُمیدیں حاصل ہوں گی۔ میرے حکم سے دہلی میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ میرا نائب السلطنت باجلاس کونسل ہندوستان میں مصارف و ترقی تعلیم کے لیے بیش قرار رقوم وقف کرے گا۔ یہ میری آرزو ہے کہ ملک میں اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال بچھا دیا جاوے جن سے وفادار، جواں مرد اور کارآمد شہری پیدا ہوں جو صنعت و حرفت، زراعت اور زندگی کے تمام دیگر شعبوں میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔

میری یہ بھی تمنا ہے کہ اشاعت و ترویج علم سے میری ہندوستانی رعایا کے گھر روشن و منور ہوں ان کی محنت و مشقت میں خوشی و خرمی پیدا ہو اور ان میں بلند خیالی، آرام و آسائش اور تندرستی و صحت کے تمام فوائد حاصل ہوں جو علم کے لوازمات میں سے ہیں۔ میری آرزو صرف تعلیم کے ذریعے سے پوری ہو سکتی ہے اور ہندوستان میں اشاعتِ تعلیم کا مقصد ہمیشہ میرے زیر نظر رہے گا۔

اِن سے زیادہ شریفانہ الفاظ اور شریف زبان نہ کبھی سنی گئی اور نہ بیان کی گئی ہے اور نہ گورنمنٹ کا رویہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ تعلیم کے متعلق پنجسالہ رپورٹ جو ہز اکسیلینسی لارڈ ہارڈنگ (یعنی وہ عالیشان اور فراخ دل مدبر جو اس وقت ہندوستان پر حکمران ہے) اس کے عہد حکومت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں صاف اور صریح الفاظ میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی اس طرح بیان کی گئی ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے نظام میں اصلاح شروع ہو گئی ہے اور پبلک فنڈ (سرمایۂ عام) سے غیر سرکاری تعلیم گاہوں کو جو امداد دی جاتی ہے وہ گزشتہ نو سال میں دو چند کر دی گئی ہے اس میں تحریر ہے کہ:-

......اُن عظیم الشان فوائد سے جو تعلیم نے ہندوستان کو بخشے ہیں نہ انکار کرنا

چاہیئے اور نہ اُن کی قدر و قیمت گھٹانا چاہیئے۔ غیر مکمل معلومات کی بنا پر جو تنقیحات کی جاتی ہیں وہ اکثر غلط ہوتی ہیں مثلاً یہ قرین انصاف نہیں ہے کہ ہندوستانی طریقوں کا جو ابھی ابتدائی حالت میں ہیں مغربی دنیا کے موجودہ طریقوں سے جو تکمیل کو پہونچ چکے ہیں مقابلہ و موازنہ کیا جائے یا نظام تمدنی اور قوائے ذہنی کے اثرات کو نظر انداز کیا جاوے۔ مزید برآں یہ عام الزام کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی بنا عام تعلیم کی نازک اور کمزور بنیاد پر رکھی گئی ہے اور یہ کہ اس کے ذرائع ناکافی ہیں ایک ایسا الزام ہے جو یورپ کے ہر ملک پر کسی نہ کسی وقت میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہندوستان ایسے منازل سے گزر رہا ہے جو دوسرے ممالک نے دوسرے زمانوں میں طے کئے ہیں۔

ذرا الفاظ ذیل پر غور فرمایئے:۔

.... اپنی پالیسی میں سب سے پہلے گورنمنٹ زیر تعلیم طلبا و انڈر گریجوئیٹس کے کیرکٹر (سیرت) کی تربیت کی خواہشمند ہے۔ سیرت کے پیدا کرنے میں گھر کے اثر اور معلم کی ذات کو بڑا دخل ہے۔ سابقہ تجربہ کی بنا پر اس امید کی کافی وجہ موجود ہے کہ جوں جوں بہتر تعلیمی حالات کے زیر اثر تعلیمی آسانیاں بڑھتی جائیں گی سوشل اصلاح کی صورت پیدا ہوگی۔ تعلیم نسواں پھیلے گی اور بہتر معلمین دستیاب ہو سکیں گے۔ اب تک مذہبی اور اخلاقی کافی امداد بھی دی جا چکی ہے اور اس اصلاح کے بہت وسیع معنی لئے گئے ہیں۔ یعنی بلا واسطہ مذہبی اور اخلاقی تربیت کے علاوہ بالواسطہ طریقوں پر بھی یہ مشتمل ہے جن میں ناصحانہ طریق، اجتماعی زندگی، روایات، انتظام ماحول حفظان صحت کی بہتری اور تعلیم کا نہایت ضروری پہلو یعنی جسمانی تربیت اور نظام تفریح بھی شامل ہے۔

اس خیال کی ایک اور عملی تردید کہ گورنمنٹ تعلیمی حوصلہ افزائی کی طرف سے ہاتھ کھینچ لینا چاہتی ہے اسلامیہ کالج پشاور کے قیام میں موجود ہے۔ جو یہاں سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے اور جو سر جارج روس کیپل کی مہربانی اور کشادہ دلی اور صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب کی حب وطن اور محنت کی یادگار رہے۔ پشاور میں اس تعلیمی تحریک کی اہمیت کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے سر ہارکورٹ بٹلر نے فرمایا تھا کہ:۔

درۂ خیبر کے دہانہ کے سامنے ایشیا کے اس مشہور شاہراہ پر کھڑے ہو کر میں اعتراف
کرتا ہوں کہ میرے تصور اور قوتِ متخیلہ پر اس آیندہ روشنی کا زبردست اثر پڑ رہا
ہے جو اس اسکول اور کالج سے نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ ایشیا کے دور دراز
گوشوں میں منعکس ہو کر پھیلے گی۔

ہم نہایت جوش کے ساتھ یہ اُمید کرتے ہیں کہ سر ہارکورٹ بٹلر صاحب کا خواب پورا ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اس تازہ گراں قدر فیاضی کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہو گا جو اسلامیہ کالج لاہور کے متعلق کی گئی ہے یہ کالج زندہ دلانِ پنجاب اور بالخصوص انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایثار اور حب وطن کی زندہ مثال ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانانِ مدراس کی تعلیمی ترقی کے لئے مالی امداد، کلکتہ مدرسہ کو اعلیٰ درجہ کے کالج تک پہونچانے کی منظوری ایک یونی ورسٹی ڈھاکہ میں اور دوسری پٹنہ میں قائم کرنے کا فیصلا اور رنگون (ملک برہما) میں ایک تیسری یونیورسٹی کے قیام کی تجویز۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا، میں خیال کرتا ہوں کہ یہ اور اسی قسم کی دیگر تحریکات اس غلط فہمی کی تردید کے لئے کافی ہیں کہ گورنمنٹ کی آیندہ پالسی ہندوستان میں یونی ورسٹی کی تعلیم کی ترقی و اشاعت کو محدود اور کم کرتا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہو گی کہ تعلیم پر بڑی بڑی رقوم خرچ کی جاویں جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تعلیم گراں ہو جائے گی لیکن گورنمنٹ کا منشا یقیناً یہ نہیں ہے کہ تعلیم کو مٹا دیا جاوے، برخلاف اس کے یہ ظاہر ہے کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے، اور نہ اعلیٰ حکام اور ماہران تعلیم کی رائیں ایسی تعلیم کی موافقت میں ہیں جو مذہب سے معرّا ہو۔ سر اینڈرو فریزر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:-

ہمیں ایک اعلیٰ تر طریق کی خواہش ہے یعنی ایک ایسے طریق کی جو انسان کی اخلاقی
اور مذہبی تربیت کے دوش بدوش ذہنی اور جسمانی تعلیم کو بھی حاوی ہو"

(ماخوذ از نائنٹینتھ سینچوری اکتوبر ۱۹۰۸ء)

مشہور مذہبی عالم اور ماہرانِ فنِ تعلیم ڈاکٹر ڈویلڈن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے انتہائی وثوق کے ساتھ جس کا اظہار مشکل ہے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ محض دنیاوی تعلیم جہاں اور جس شخص کو بھی دی جائے گی اس کا نتیجہ قابلِ افسوس ناکامی کی صورت میں رونما ہو گا۔

اے حضرات! ملک معظم کی تقریر سے، مختلف سرکاری رپورٹوں کے اقتباسات سے اور ممتاز عہدہ دارانِ سرکاری کے آراء سے صاف ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے متعلق قدم ہرگز پیچھے

نہیں ہٹایا جا سکتا۔ یہ تمام رائیں جس عقیدے پر متحد و متفق ہیں وہ یہ ہے کہ کوئی تعلیم جو مذہبی اور اخلاقی تربیت سے معرا ہو، وہ ضرور ناکام رہے گی۔ اس لئے میری یہ پختہ رائے ہے کہ مسلمانوں کی قوم کو جنھوں نے یونیورسٹی کی تحریک سے اپنی آیندہ نسلوں کی تعلیم کی خصوصیت اور تربیت کے حصول کا فیصلہ کر لیا ہے تو مذہبی تربیت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ اب گزشتہ حالات کی طرف مراجعت نہیں ہو سکتی، لیکن جیسا کہ میں پیشتر عرض کر چکا ہوں، اس امر میں کچھ بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آیندہ تعلیم گراں تر ہوتی جائے گی۔ بہتر مکانات، بہتر سازو سامان، بہتر عملہ اور بہتر ماحول بلاشبہ آخرالامر تعلیم کی خاصیت کو ترقی دینے والے ثابت ہوں گے۔ اور اس سے اُس چیز کا حصول زیادہ آسان ہو جائے گا جسے گورنمنٹ نے اپنی پالسی کا "مقصد اولین" قرار دیا ہے۔ لیکن یہ صورت مسئلہ بہ نسبت سابق زیادہ اخراجات کی موجب ہوگی اور یہ امر مسرت خیز ہے کہ گورنمنٹ نہ صرف اس حیثیت سے واقف ہے بلکہ ان روایات کے مطابق جو ایک روشن ضمیر، فیاض اور ترقی کن حکومت کے لئے مخصوص ہوتی ہیں وہ اس سوال کے مالی پہلو پر توجہ کرنے کے لئے بھی تیار ہے۔

اب میں اس حالت کے متعلق عرض کرتا ہوں جو اعلیٰ تعلیم میں ہماری ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ ابتدائی تعلیم میں من حیث القوم ہماری حالت کسی قدر بہتر ہے لیکن اعلیٰ تعلیم میں ہم دیگر اقوام کے مقابلہ میں بہت پس ماندہ ہیں۔ تلافی مافات کی سخت ضرورت ہے۔ آرٹس کالجوں میں ہمارا اوسط صرف ۱۰.۴ ہے یعنی کالج کے ہر سو طالب علموں میں سے صرف دس مسلمان ہیں۔ کسی پیشہ کی تعلیم دینے والے کالجوں میں یہ اوسط اور بھی کم ہے یعنی صرف دس ہے۔ ثانوی تعلیم میں بھی ہماری حالت کچھ اچھی نہیں ہے، اور تعلیم کے مدارس میں ہر سو میں صرف ۱۹ طلبا مسلمان ہیں۔ عام تعلیم گاہوں میں بھی مسلمان طلباء کی تعداد دیگر اقوام کے مقابلے میں حوصلہ افزا نہیں ہے۔ صوبہ وار تفصیل پر اگر غور کیا جائے تو صوبہ مدراس میں ہر سو طالب علموں میں سے مسلمان تو ہیں، بمبئی میں ۱۶، بنگال میں تقریباً ۱۸، ممالک متحدہ میں ۱۵، پنجاب میں ۲۰.۸، برہما میں ۳، مشرقی بنگال و آسام میں ۵۲، ممالک متوسط و برار میں ۹، کرگ میں ۲ اور صوبہ شمال و مغرب سرحدی میں ۴۲.۱ صرف شمال و مغرب سرحدی و مشرقی بنگال و آسام ہی وہ صوبے ہیں جس میں مسلمانوں کا اوسط زیادہ ہے اور اس طرح پر یہ امر ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں ہنوز ہماری

حالت بہت پست ہے اور ضرورت ہے کہ تلافی مافات کرنے اور دیگر اقوام ہند کے دوش بدوش ہونے کے لئے مستقل اور زبردست جدوجہد سے کام لیا جاوے۔

حضرات! ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے جو اگرچہ ابتدائۃً تعلیم سے علاقہ نہیں رکھتا لیکن بالآخر اس سے گہرا تعلق رکھتا ہے وہ یہ کہ تعلیم کی مجموعی اور آخری صورت کیا ہونا چاہیئے؟ میں یہاں اس امر کے فلسفے پر بحث کرنا نہیں چاہتا کہ علم کو علم کی خاطر حاصل کیا جاوے۔ یہ ایسا مبحث ہے جس کو میں دیگر حضرات کے لئے چھوڑتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک جب ایک شخص کو خوراک کی حاجت ہو تو فلسفہ اس کے لئے وجہ تسلی نہیں ہو سکتا اور اگر ہم ایک بھوکے اور قحط دیدہ گرسنہ کے دل کو افلاطون کے اصول فلسفے کے بیان سے تسلی دینا چاہیں تو یہ وہ بات ہوگی کہ ایک گداگر کے ہات میں جو روٹی کے لئے چلا رہا ہو ہم پتھر کا ٹکڑا رکھ دیں۔ میں دوسرے ممالک کی بابت تو جانتا نہیں کہ وہاں حالات مختلف ہیں، لیکن ہندوستان کی حالت کے لحاظ سے بالعموم ہمارے لئے سوائے اس کے اور چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم اُس قسم کی تعلیم کے حصول کی جدوجہد کریں جو طنزاً "دال روٹی" کی تعلیم کہلائی جاتی ہے۔ اگر ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوتا ہے تو میرے خیال میں اس کا سبب نتائج تعلیم کے متعلق فلسفیانہ خیالات کی کمی نہیں ہے بلکہ اس قسم کے اقتصادی حالات ہیں جو دیگر معاملات کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ناقابل تسخیر ثابت ہوئے ہیں۔ ہندوستانی تعلیم کے اس پہلو کے متعلق لارڈ کرزن کی جو رائے تھی وہ گورنمنٹ ہند کے رزولیوشن مورخہ ۲۱ر مارچ ۱۹۱۴ء میں بالتفصیل مذکور ہے اور اس رزولیوشن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"......مختلف اسباب نے، جن میں سے کچھ تو تاریخی اور کچھ اجتماعی ہیں، باہم مل کر بہ نسبت انگلستان کے ہندوستان میں نمایاں صورت میں یہ نتیجہ پیدا کیا ہے کہ اکثر طلبا، جن سے اعلیٰ مدارس اور یونیورسٹیاں معمور ہیں، اپنے تئیں حصول معاش کے قابل بنانے کی غرض سے داخل ہوئے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ سرکاری ملازمت کو زیادہ قابل وثوق، زیادہ معزز اور زیادہ پسندیدہ طریق معاش خیال کرتا ہے اور طلبا کی طرف سے ان کثیر التعداد منافع کی آرزو ان اسکولوں اور کالجوں کو اپنے اُن مناسب فرض کی ادائگی کے مانع آتی ہے جو آزادانہ تعلیم کے مخزن کی حیثیت سے اُن پر عائد ہے۔ اِن وجوہ کی بنا پر بار بار اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ

ہندوستان میں تعلیم کے اعلیٰ فوائد کو اس رائج الوقت طریق سے سخت نقصان پہنچ رہا ہے کہ سرکاری ملازمت کے امیدواروں کا انتخاب یونیورسٹی اور اسکول کی سندات پر منحصر رکھا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس پہلو میں یہاں تک ترقی کی ہے کہ اُن کے خیال میں اگر سلطنت سے یہ مادّی تعلقات منقطع ہوسکیں اور انگلش سول سروس کمیشن کے طریق پر ایک خاص بورڈ کے ماتحت پبلک سروس کے متعلق الگ امتحانات مقرر کئے جاسکیں تو تعلیمی معیار بہت بلند کیا جاسکتا ہے۔ ..."

لارڈ کرزن کی گورنمنٹ نے اس رائے کو قبول نہیں کیا لیکن مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میری اس رائے سے متفق ہوں گے کہ موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال ضرور قابل بحث ہے کہ آخر ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان کیا کرنے والے ہیں؟ یہ تو محال ہے کہ سب کے سب سرکاری ملازمت اختیار کریں۔ ان میں سے اکثر قانونی پیشہ اختیار کرسکتے ہیں، جس میں اگرچہ پہلے ہی سے بہت کچھ اژدحام ہے۔ تاہم مسلمانوں کے لئے جگہ نکل سکتی ہے۔ بہت سے انجنیری کے پیشے میں جاسکتے ہیں، جس میں ہماری معدومیت شہرۂ آفاق ہے اور بہت سے طب کے پیشے میں داخل ہوسکتے ہیں جس میں ہمارا وجود برائے نام ہے۔ لیکن بایں ہمہ ایسے گریجویٹس کی ایک کثیر تعداد باقی ہے گی جنھیں مناسب جگہ ملنے کی کوئی توقع نہیں ہوسکتی، اور جوں جوں ہر سال مختلف یونی ورسٹیاں تعلیم یافتہ طبقے میں اضافہ کرتی جاتی ہیں اُن سب کے لئے حصول معاش کا مسئلہ نہایت ضروری اور سخت مشکل صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس سوال نے پہلے ہی ہمیں بہت کچھ متفکر کر رکھا ہے۔ اور اگر ہم نے اسے حل کرنے کی کوشش کی تو عنقریب سخت مشکل حالات کا مقابلہ ہوگا۔ میں مایوس نہیں ہوں مگر میرا خیال ہے کہ ہمیں زندگی کے دوسرے طریقوں کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہئے اور اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے میری رائے میں ضروری ہے کہ تعلیم کو ایسی صورت میں لایا جائے جو زیادہ تر عملی ہو اور ضروریات زندگی کے لئے زیادہ موافق ہو۔

صنعتی و حرفتی تعلیم — ہم دماغی قابلیت کے انعام جیتنے کی سعی و کوشش میں اس قدر منہمک ہیں کہ صنعت و حرفت کے متعلق ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن کی طرف سے قطعاً غافل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مسٹر ٹاٹا اور دیگر ملک التجار حضرات کے ہم ممنون احسان ہیں جو ہندوستان کی سب سے زیادہ حوصلہ مند قوم یعنی پارسیوں سے تعلق رکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک صنعتی تعلیم گاہ کے قائم کرنے کے

علاوہ لائق اور منتخب ہندوستانیوں کو صنعت و حرفت و دستکاری و فنون کی تعلیم کے لئے ممالک غیر میں بھیجنے کی غرض سے متعدد انتظامات کر رکھے ہیں۔ پنجاب میں ہندو جوبلی ٹیکنکل انسٹیٹیوٹ قائم ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ ۔۔۔ن کے مقابلہ میں ہمارا ابھی کوئی اسکول ہو۔ بنگال میں رائے بہادر نریندر ونا تھ سین اور سر چندر ماد ب گھوش کے فرزند بابو جے سی گھوش جیسے اصحاب کی مسلسل مستعدی کی بدولت صنعتی تعلیم کی ترقی کے لئے ایک انڈین ایسوسی ایشن قائم ہے جو مفید کام کر رہی ہے اور جو ہر سال طلبا کی جماعتیں صنعت کے متعلق علمی اور عملی معلومات حاصل کرنے اور آخر الامر حرفت کا کوئی شعبہ اختیار کرنے کی غرض سے انگلستان، امریکہ اور جاپان بھیجتی رہتی ہے۔ بد قسمتی سے اب تک من حیث القوم نہ ہمارے پاس کوئی اس قسم کی درس گاہ ہے اور نہ کوئی اس قسم کی انجمن ہے اور نہ اپنے نوجوانوں کو جن پر ہماری آیندہ اُمیدوں کا انحصار ہے، اس شعبہ کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کی ہے، جو آیندہ ہمارے اِن بیکار افراد کے لئے میدانِ جد و جہد کی صورت اختیار کرنے والا ہے جو سرکاری ملازمت کے دروازے اپنے لئے مسدود پائیں گے۔ میں اس امر سے ناواقف نہیں ہوں کہ بمبئی کے ممتاز لکھ پتی سر ابراہیم کریم بھائی کی شاہانہ فیاضی کے طفیل سے علیگڑھ میں ایک کالج کی بنیاد پڑ چکی ہے، جو پرنس آف ویلز سائنس کالج کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن جو رقوم جمع ہوئی ہیں وہ نہ صرف بہت قلیل ہیں بلکہ اس کالج کو عملی صنعت کے مکمل کے درجہ تک پہونچانے کی غرض سے جس وسعت کی ضرورت ہے اس کے مقابلہ میں سراسر حقیر کفتی ہیں۔ اُس زمانہ میں جبکہ بقول ایک ممتاز مصنف کے (ترقی صنعت مصنفہ ایچ گھوش) اس ملک کے باشندے "قدرت کی فیاضیوں" کی بدولت صنعت و حرفت کے زیادہ محتاج نہ تھے اور زراعت ہی ان کے لئے ہر طرح سے کافی تھی، صورتِ حال آج سے مختلف تھی۔ لیکن جوں جوں آبادی بڑھتی گئی زمین کی زرخیزی میں فرق آتا گیا۔ آزاد تجارت کے اصول رائج ہو گئے۔ ہندوستان کے حالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہو گئی اور اب اس ملک کی اقتصادی تجارت اگر تمام تر نہیں تو ایک بڑی حد تک ضرور محض زمین کی پیداوار پر نہیں بلکہ صنعت و حرفت اور تجارت پر منحصر ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ مغربی تعلیم کی طرح ہمارے ہندو بھائی صنعت و تجارت میں بھی ہم پر سبقت لے جا چکے ہیں۔ تیس سال کا عرصہ گزرا ہے کہ مسلمانانِ ہند بڑی یاس و ناامیدی کی حالت میں نوحہ زنی کرتے تھے کہ ہم انگریزی تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تیس

چالیس سال بعد ہمیں پھر یہ شکایت لاحق ہوگی کہ صنعت وحرفت اور تجارت کے زیادہ پُر امن شعبوں میں ہم دیگر اقوام کے مقابلے میں بالکل پس ماندہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں من حیث القوم سرکاری ملازمت کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کرلینا چاہئیں یا مختلف آزاد پیشوں کی طرف مثلاً قانون، طب اور انجنیری کی طرف مائل نہ ہونا چاہئے بلکہ ہم میں ایک کثیر تعداد کو چاہئے کہ ان شعبوں میں داخل ہو، حقیقت حال یہ ہے کہ بمقابلہ دیگر اقوام کے سرکاری ملازمت میں ہمارا حصہ بالکل قلیل ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ مختلف سرکاری ملازمتوں کے متعلق ہمارے جائز حقوق پر ہماری تعداد کے لحاظ سے ضرور توجہ کی جائے گی۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ کسی قوم کے تموّل کا اندازہ سرکاری ملازمت میں اس کی نیابت سے نہیں کیا جاسکتا انگلستان یا حقیقت میں یورپ کے کسی اور ملک کی دولت اور ثروت، اُن کے مصنوعات کی وسعت اور اُن کی تجارتی ترقی اور قابلیت پر منحصر ہے۔ اس کشمکش حیات میں جو ہمارے گرد جاری ہے میں اپنے نوجوانوں کو زیادہ آزاد اور سودمند پیشوں کی طرف متوجہ ہونے کی نصیحت کرتا ہوں۔ انھیں چاہئے کہ اپنے تئیں تجارت اور صنعت وحرفت کے کاموں میں لگائیں اور ملک کے اُن ذخائر کی تلاش کریں جو مشترک سرمایہ اور باقاعدہ محنت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اُنھیں باہر جاکر بڑے بڑے کارخانوں اور عظیم الشان تجارتی دوکانوں میں کام سیکھنا چاہئے اور پھر خود اپنا کاروبار جاری کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں تجارتی کاروبار کے لئے کافی سرمایہ مہیا کرنا مشکل ہے۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ہم تھوڑی بہت شروعات ہی نہیں کرسکتے یا تجارت کے کاموں میں ہمیں بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے پیشے کچھ کم نہیں ہیں، جن کو ہم قلیل سرمایہ سے چلا سکتے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے معقول آذوقہ حاصل کرسکتے ہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ کسی قوم کی صنعتی دولت کی تاریخ درا صل اس کے کاموں کی معمولی ابتدا کی تاریخ ہوتی ہے اور قناعت استقلال اور محنت ومشقت کے اوصاف اُس کامیابی کے لئے کچھ کم ضروری اوصاف نہیں ہیں جو تموّل و دولت وثروت کا باعث ہوتی ہے۔ سرزمین ہند میرے خیال میں ایسے وسائل اور ذرائع سے بھرپور ہے جن کی اب تک کسی کو خبر نہیں اور جن سے اب تک کسی نے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ بہت سی خام پیداواریں ہیں جو ممالک غیر کو جاتی ہیں اور وجود ہاں سے اشیاء درآمد اور نفیس فیشن ایبل اشیائے تجارت کی شکل میں واپس آتی ہیں۔ جن کو ہم اصلی قیمت سے سو گنا زیادہ دام دے کر

خریدتے ہیں بے شبہ ایسی دستکاریاں بھی ہیں جو بغیر سرمایہ کثیر کے نہیں چلائی جا سکتیں مثلاً لوہا، کپڑا بننے اور کاغذ بنانے کی کلیں، لیکن ایسی دستکاریوں کی تعداد بھی بے شمار ہے جن کی چلانے کے لیے سرمایہ کی اس قدر ضرورت نہیں ہے جس قدر محنت اور استقلال کی۔ افسوس ہے کہ شکر سازی کی صنعت جو بالکل دیسی صنعت ہے اب بہ نسبت سابق رو بہ تنزل ہے اور ظروف سازی کی قدیم صنعت بھی سرمایہ اور محنت کی کمی کی وجہ سے پژمردہ ہو رہی ہے۔

سیوان اور کھلنا واقع بنگال۔ اعظم گڈھ۔ آگرہ۔ چنار۔ لکھنؤ اور میرٹھ واقع ممالک متحدہ داود ھ سلیم مدورا واقع احاطۂ مدراس اور ہالا و بمبئی واقع احاطہ بمبئی کی منقش ظروف سازی کی صنعت آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی ہے۔ روغن دار ظروف سازی جو ایران کے قدیم ظروف کی نقل تھی اور جس کی نسبت سر جارج برڈ وڈ کا قول ہے کہ افغان مغلوں کے ذریعہ سے ملک چین سے ایران میں تیمورلنگ کی چینی ملکہ کے اثر سے داخل ہوئی تھی وہ ایک زمانہ میں دہلی، پشاور لاہور اور ملتان میں خوب رائج تھی اور یہ نامور مقبروں، قبروں اور محلات کی صناعی کے کاموں کی خوبی کو بڑھانے اور دیرپا رکھنے کے کام میں لائی جاتی تھی۔ مگر اب یہ فن اپنی جاں کنی کی حالت میں ہے۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی آرٹس یا فنون کا خاصہ ہے کہ یا تو وہ ایک خاص حالت پر آکر رک جاتی ہیں یا اُن میں تنزل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ معدوم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قدیم زمانے کے رتھ کو لیجئے کہ کسی نے اس کی جائے نشست میں ترقی کرنے یا رفتار میں تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پس مغرب کی صنعت و حرفت کے نت نئے اصول اور نمونوں کی ترقیات کے مقابلے میں یہ صنعتیں قدرتی طور پر معدوم ہوتی جائیں گی۔ اب حالت یہ ہے کہ بجائے دہلی، لاہور اور ملتان کے روغن دار ظروف کے ریلوے اسٹیشنوں کے مسافر خانوں کے کمروں یا مشاہیر کے محلات میں یا مغربی ممالک اور انگلستان کے ظروف نظر آتے ہیں۔ لیکن ظروف سازی کے لئے کسی بڑے سرمایہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مصالحہ ارزاں اور آسانی دستیاب ہو سکتا تھا اور کاریگر بھی بلاتکلف مہیا ہو سکتے تھے۔ ایک شخص جس میں عملی کام کرنے کا مادہ ہو اور حرفت سے کسی قدر واقفیت اور انتظامی قابلیت ہو وہ اس صنعت کو سرسبز اور کاروبار کی حالت میں پہنچا سکتا ہے۔ ماسوا اس کے شیشہ سازی کی حرفت ہے جس کو زمانہ حال کے طریقے پر نہیں چلایا گیا۔ راجپوتانہ اور دیگر ریگستانی علاقہ جات میں بغیر کسی کثیر سرمایہ کے اس کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ شیشہ سازی کی حرفت کے صرف دو کارخانے قابل ذکر ہیں ایک تو اپر انڈیا گلاس ورکس انبالہ میں

جس کی بنیاد ۱۸۹۵ء میں پڑی تھی اور دوسرا ممالک متحدہ میں بمقام نینی میں ہے۔ ایک کارخانہ کلکتہ میں بھی ہے لیکن اس کا مال ایسا اچھا نہیں کہ جس کی توقع ہو سکتی تھی۔ دوسرے مقامات میں بھی شیشہ سازی کی غیر منتظمانہ جدوجہد کی گئی مگر وہ یا حالتِ نزار میں ہیں یا بند ہو گئے ہیں اور اس طرح پرانے شیشہ گروں یا چوڑی گروں کو روٹی کمانا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس قسم کے خانگی ضروریات کی اشیا جیسے بچوں کے آئینے۔ لیمپوں کی چمنیاں۔ فانوس اور شیشے کے گلاس، ان چیزوں تک کے لئے ہمیں بلجیم، آسٹریا اور جرمنی کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ دروازوں کے پردوں کے لئے موتی اور پوتھ وینس اور وائنا سے منگوانے پڑتے ہیں۔ میں نے ہندوستان کی پژمردہ صنعتوں کے متعلق آپ کی سمع خراشی صرف اس لئے نہیں کی کہ ہم ان کی طرف سے بے پرواہی کرتے ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ کیسے ظلم کی بات ہے کہ ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ ہندوستان کے دوکاندار پیدائشی دوکاندار ہوں۔ اور کمہار پیدائشی کمہار ہو۔

قصہ کوتاہ ہماری حالت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے تجارتی کاروبار اور دوکانداری میں پہلے ہی سے ہم ہندو دوستوں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور سرمایہ مشترکہ کی کمپنیوں کے مقابلے میں بھی ہم میں اور ابنائے وطن میں اس سے کچھ کم تعدد فصل نہیں ہے۔ میں یقین نہیں کرتا کہ یہ بات محض ہمارے افلاس اور تنگدستی کے سبب سے ہے۔ بے شک ہم غریب ہیں اور غریب اس لئے ہیں کہ بمقابلہ اپنے متحمل اور سرسبز اور کفایت شعار ہندو بھائیوں کے ہم غیر مآل اندیش اور مسرف ہیں۔ تجارتی معاملات میں ہمارے مقابلتہً پیچھے رہ جانے کے اور بھی وجوہات ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ ہم باقاعدہ کاروبار کے طور طریق سے ناآشنا ہیں۔ دوسرے ہم کو یہ ایک مہمل شک رہتا ہے کہ شاید اس کام کے کرنے میں فائدہ ہو یا نہ ہو اس لئے ہمارے صاحبِ جائداد اور متمول لوگ بہت سے ایسے ہیں جو تجارتی کاروبار میں ہاتھ ڈالتے جھجکتے ہیں۔ بہت سے ہندو والیانِ ریاست، مالکان اراضی اور زمیندار تجارتی کمپنیوں میں ہمیشہ حصہ لیتے رہتے ہیں جیسا کہ ہز ہائینس راجہ صاحب نابھہ، رائے بہادر لالہ رام سرن داس صاحب اور ایسے ہی بہت سے دیگر اصحاب ہیں لیکن کوئی نواب یا کوئی اور بڑے مسلمان صاحبِ اراضی کسی تجارتی کمپنی میں شرکت کرنا اپنی شان کے خلاف تصور کرے گا انگلستان اور دیگر ممالک مغربیہ میں لارڈز اور دوسرے بڑے بڑے آدمی تجارتی کاروبار میں نمایاں حصہ لیتے ہیں لیکن من حیث القوم ہماری سمجھ ہی میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ طبقہ متوسطہ کے تعلیم یافتہ اور کاروباری لوگوں کے ساتھ

ارباب دولت کے کام کرنے سے ایک قسم کی ساکھ قائم ہوتی ہے جس کے بغیر بہت ہی تھوڑے تجارتی کاروبار ہوں گے جو شروع کئے گئے ہوں۔

حضرات! ہندوستان میں تعلیم عامہ کے ہم پلہ تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی ہے آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ ایک بڑا نازک مسئلہ ہے کیونکہ اس کا اثر ہندو اور مسلمان دونوں کی عزیز مقدس رسوم پر پڑتا ہے یا پڑنے کا احتمال ہے۔ اختلاف آراء صرف اس سوال کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس سوال کے متعلق بھی ہے کہ عورتوں کے درس کے لئے کس قسم کی کتابیں ہونا چاہئیں جو اُن کے اور جماعت نسواں دونوں کے حق میں سودمند ہوں۔ پس اس سوال کے دو شق ہیں۔ (۱) یہ کہ طریق تعلیم کیا ہو؟ - (۲) نصاب تعلیم کیا ہو جو عورات کے لئے سودمند ہو؟ طریق تعلیم کے متعلق آزادی پسند جماعت کی تو یہ رائے ہے کہ جب تک پردہ کا رواج قائم رہے گا عورتیں تعلیم نہیں پا سکیں گی اور پا سکیں گی تو وہ تعلیم کافی نہ ہوگی۔ قدامت پسند یا وہ لوگ جو زیادہ صحیح طور پر کنسرویٹو کہے جا سکتے ہیں اس کے بالکل مخالف ہیں کیونکہ اس سے پردہ کی جس کو وہ دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں بے حرمتی ہوتی ہے۔ وہ اس امر کو نہایت تباہ کن سمجھتے ہیں کہ آزادی پسند جماعت کا یہ خیال ہو کہ زنانہ اسکول کی چار دیواری میں گویا اصلاح کی عیب کا گولا پھینکا جائے تجربہ اور (بہترین استاد) زمانہ شاید بتلائے کہ ہم اپنے جسم کے بہترین حصے کو (عورات کو) کس طریق سے بہترین تعلیم دے سکتے ہیں۔ لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ اس امر کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار سے میں آپ کی سمع خراشی کروں مگر ما جان۔ ایک بات کا تو مجھے یقین واثق ہے کہ ہمارا مذہب صاف طور پر تعلیم نسواں کا ممد و معاون ہے طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ - میں باور کرتا ہوں کہ اس امر میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو تعلیم دی جانی چاہئے۔

گھر جہاں بچے پرورش اور تربیت پا کر مرد اور عورت بنتے ہیں اُس عادت کے لحاظ سے اچھے یا برے ہوتے ہیں جو وہاں حکمراں ہوتی ہے اور جو طاقت گھروں پر حکمرانی کرتی ہے وہ ماں ہوتی ہے۔ سب سے پہلا اور بڑا معلم مثال ہوتی ہے اور یہ مثال ماں ہی کی ہوتی ہے جو ہمیشہ بچوں کے پیش نظر ہوا کرتی ہے اور اُن کی زندگی پر اس کا ہی اثر پڑا کرتا ہے۔ بچپن کے زمانہ میں جو بہت اثر پذیر اور تقلید کا زمانہ ہوتا ہے یہ ماں ہی کا سانچہ ہے جس میں نوزائیدہ بچہ ڈھلتا رہتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ رنج یا راحت، روشن دماغی یا جہالت مزاج اور طبیعت اور عادت کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا انحصار جن کے ساتھ ساتھ پرورش پاتا ہے ایک بڑی حد تک اُن اختیارات کے استعمال پر ہوتا ہے جو عورت کو گھر کی خاص بادشاہت میں

حاصل ہوتے ہیں عورتیں ہمارے نیک و بد اور رنج و راحت کی شریک حال ہوا کرتی ہیں جب صورت حال یہ ہے تو ہم پر مذہباً اخلاقاً اور مجلسی قواعد کی رو سے واجب اور لازم ہے کہ ہم ان کو تعلیم دیں اور اس قابل بنائیں کہ زندگی میں وہ ہمارے لئے ایک رفیق اور ہمدم ثابت ہوں اب سوال یہ ہے کہ وہ تعلیم کونسی ہے جو دی جائے. حضرات! اگرچہ میں اس امر میں مخالفین تعلیم نسواں کے ہم رائے نہیں ہوں کہ عورتوں کو جغرافیہ کی اتنی تعلیم ہو کہ وہ گھر کے مختلف کمروں کو جان لیں کیمسٹری کی اسقدر کہ پانی کا اُبلنا جانیں اور تاریخ کی اسقدر کہ اپنے والدین کے مختلف رشتہ داروں کو معلوم کر لیں تاہم برخلاف اس کے میں اس تعلیم کا بھی سخت مخالف ہوں جو عورت کو اس کے دائرہ سے نکال دے یا اس کو گھر کی چار دیواری کو اس سے چھڑا دے! اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے اسکیم میں میں مذہبی تعلیم اور کامل مذہبی تعلیم کو سب سے اول جگہ دونگا اس کے بعد سینا پرونا سوزن کاری اور خانہ داری کی تھوڑی تعلیم حفظان صحت کا علم ان کے علاوہ انگریزی سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہو تاکہ دوائی شیشیوں کے لیبل اور دوسری ضروریات خانہ داری کی چیزوں کے ناموں کی شناخت ہو سکے۔

حضرات! اس بارے میں آپکے کچھ ہی خیالات کیوں نہ ہوں کہ ہماری مستورات کو کس طریق پر تعلیم دی جائے اور میں جانتا ہوں کہ ابھی اس پر سب کا اتفاق رائے بھی نہیں ہوا ہے لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہے وہ یہ کہ اگر آپ تعلیم نسواں کی مخالفت بھی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اصولاً بھی ہم کو یہ تعلیم دلانا چاہئے اور اس کی طلب اور بہم رسانی کے اعتبار سے ہم پر لازم ہے کہ ہم تعلیم دلائیں۔ زمانہ اس کی تائید میں ہے اور جس طرح ہم آبشار نگرا کو روک نہیں سکتے اسی طرح ہم اُن کی تعلیم کی بھی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ ٹرکی اور مصر میں پہلے ہی سے تعلیم نسواں کی بابت ایک فیصل شدہ تحریک موجود ہے۔ ہندوستان میں بھی دیگر اقوام اس خصوص میں سرگرمی دکھلا رہی ہیں بنگال میں ہندوؤں نے اور حیدرآباد میں مسلمانوں نے اس میں بڑی ترقی کی ہے۔ بمبئی اور مدراس میں نوجوان لڑکیوں کی تعلیم کا خوب بندوبست ہو گیا ہے اور بھوپال میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی فیاضی کی بدولت ایک بہت عمدہ درس گاہ نوجوان خواتین کے لئے جاری کی گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مستورات کو تعلیم یافتہ بنانے کی مخالفت ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اس کی تعلیم کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو سب سے اول جگہ دیں تو یہ مخالفت جاتی رہے گی۔

حضرات! ایک بات مجھے سب سے زیادہ کھٹکتی ہے اور جس پر اس قدر غور نہیں کیا گیا جس قدر کی وہ مستحق ہے۔ ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سے ایسے طالب علم ہوتے ہیں جو میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر لینے کے بعد بوجہ نہ ہونے کافی ذرائع کے تعلیم آگے جاری نہیں رکھ سکتے۔ ہم نے اپنی قوم کے اُن نادار غیر مستطیع طلبا کی امداد کے لئے ابتک کچھ نہیں کیا۔ مسلمانوں کی بڑی ضرورت ہے کہ چند وظائف کا اہتمام کیا جائے جن سے غریب اور مستحق طلبا کو مدد مل سکے۔ یہ ضرورت نہیں ہے کہ سارا ہندوستان مل کر ایسے وظائف مقرر کرے اور اگر ایسا ممکن ہو تو مجھے کوئی وجہ مخالفت نہیں ہوگی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ عملی طور سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہر ایک صوبہ یا ضلع میں اس مطلب کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ فنڈ ہوں۔ کام کرنے والوں کی ایک شریف جماعت

۔۔۔ جس کا نام انجمن ترقی تعلیم امرتسر ہے اس بارہ میں نہایت عمدہ تحریک جاری کی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ دوسرے اضلاع میں بھی اس کی تقلید کی جائے گی اور جہاں جہاں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا ہے وہاں ایک ۔۔۔ ٹرسٹ ایجوکیشنل فنڈ کے قائم کرنے کے متعلق وصولی چندہ کے لئے ایک کارکن کمیٹی کے قائم کرنے میں دریغ نہ ہوگا۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو مجھے یقین ہے کہ اپنی قوم کے تعلیمی درجہ کو دیگر اقوام کے پہلو بہ پہلو کرنے کے اہم مسئلہ میں ہم کامیاب ہوں گے۔

ایک اور معاملہ بھی ہے جس کی اسی طرح کم توجہ کی گئی ہے۔ یعنی علوم قدیمہ کی استواری جس کا حوالہ نمایاں طور سے حضور ملک معظم نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایڈریس کے جواب میں دیا تھا۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے ترقی دینے میں بحیثیت ایک قوم ہم نے یا تو بہت کم جدوجہد کی ہے یا عملاً کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد میں اس کو بھی شامل ہونا چاہئے۔ لیکن کسی ملک میں بھی حتیٰ کہ اُن ممالک میں جہاں یونیورسٹیاں بکثرت ہیں قدیم علوم کی اشاعت کرنے کا کام یا السنہ قدیم اور قدیم فلسفہ اور تاریخ کو ترقی دینے کا کام محض یونیورسٹیوں پر بلا امداد و معاونت نہیں چھوڑا گیا۔ سوسائٹیاں، تعلیم گاہیں، مدارس اور انجمنیں اس کے کام میں امداد اور تقویت دیتی ہیں۔ لیکن اس میں کچھ شبہ ہے کہ ہمارے یہاں بھی کوئی ایسی سوسائٹی ہے یا اُس کے پاس اس کام کے لئے سرمایہ ہے کہ متلاشیان علوم کے لئے ترجمہ اور اخذ مطالب سے وہ خزانۂ علوم بہم پہنچائے جو عربی یا فارسی السنہ میں یا نایاب قلمی نسخہ جات میں مجھے پڑے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم کوئی ایسی انجمن قائم کرنے کی سرگرمی کے ساتھ سعی کریں جو السنہ مشرقیہ کے تراجم و اشاعت کا کام کرے تو ہماری یہ کوشش حق بجانب ہوگی۔ پنجاب میں سردار سندر سنگھ مجیٹھہ کی سعی و کوشش سے اس قسم کی ایک تحریک کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ بنگال میں ہندوؤں کی ایک سبھا شاھتیا پاریشاد نام کی قائم ہے۔ بمبئی میں بھی اس قسم کی انجمن ہے جس کی کامیابی راناڈے اور تیلانگ جیسے اصحاب کے طفیل میں ہوئی ہے۔ الٰہ آباد میں نہایت مفید کام پنینی کے دفتر میں تراجم اور طبع کے ذریعہ سے ہو رہا ہے، لیکن ہمارے یہاں اس قسم کی کوئی انجمن نہیں ہے۔

اے حضرات کانفرنس! میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا جس کے لئے میں خواستگار معافی ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے صبر اور توجہ سے میری تقریر کو سنا جس کو میں صرف ایک بات اور کہہ کر ختم کرتا ہوں۔ آپ کا مقصد درحقیقت نہایت اعلیٰ اور شریفانہ مقصد ہے۔ میری مراد اس مقصد سے ہے جو آپ اپنے ہم مذہبوں کی تعلیم کے لئے سرانجام دے رہے ہیں۔ تعلیم مثل خیرات کے ہے اس کو برکت دیتی ہے جو اُسے لیتا ہے یا دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے لئے اس کو ایثار۔ استقلال اور اس قوت ارادی کی ضرورت ہے جو ہم اس کے لئے صرف کر سکیں، اور اس لئے میں دست بدعا ہوں کہ آپ کو اُن مقاصد میں جو آپ کے پیش نظر ہیں اعلیٰ طور پر کامیابی حاصل ہو۔

اجلاس منعقدہ راولپنڈی میں منظور ہونے والی قراردادیں

اس اجلاس میں مندرجہ ذیل امور پر خاص طور پر بحث ہوئی اور یہ تجاویز منظور کی گئیں۔

۱۔ مدراس میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اسکولوں کا قیام۔

۲۔ کلکتہ کے مدرسہ کو اسلامی کالج بنائے جانے کی تحریک۔

۳۔ کلکتہ یونی ورسٹی کے اس فیصلہ سے اختلاف کیا گیا کہ وہاں ایم۔اے۔ کلاسوں سے عربی اور فارسی کو ترک کر دیا جائے۔

۴۔ راولپنڈی ڈویژن کے مسلمانوں کی درخواست برائے وصول یابی چندہ (۳ پیسہ فی روپیہ) کی منظوری۔

(''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال'' از امان اللہ خاں شیروانی، ص ۸۲،۸۳)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال

امان اللہ خاں شیروانی

سابق پرنسپل
اسلامیہ کالج، اٹاوہ

آنریری جوائنٹ سکریٹری
آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
سلطان جہاں منزل ☆ علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

عکس سرورق: "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال" مرتبہ امان اللہ خاں شیروانی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۹۴ء

دستاویزات کانفرنس سلسلہ ۴

رپورٹ

متعلق اجلاس بست وہشتم

آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس

بمقام راولپنڈی

منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء

جو حسب ہدایت نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب آنریری سکرٹری

زیر نگرانی آفتاب احمد آنریری جائنٹ سکرٹری مرتب کی گئی

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

انسٹیٹیوٹ پریس علی گڑھ میں طبع ہوئی

(اور صدر دفتر کانفرنس سے شائع ہوئی)

عکس سرورق: رپورٹ متعلق اٹھائیسواں سالانہ اجلاس ۱۹۱۴ء۔ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ راولپنڈی، طبع علی گڑھ ۱۹۱۸ء

کچھ مخلص احباب اس فقیر کو "جنونی" کہتے ہیں۔ صاحب جنوں ہونا اپنی جگہ بہت بڑی بات ہے جس کا میں خود کو اہل نہیں پاتا۔ اس میں کلام نہیں کہ جب سے حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کا دامن تھاما ہے، تحقیق و جستجو کے صحرا کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ یوں سیلانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مقامی طور پر مواقع کچھ زیادہ نہیں پاتا، تو اکثر کراچی نکل جاتا ہوں۔ قائد ملت اسلامیہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۱ دسمبر ۲۰۰۳) کے عُرس پر حاضری یقینی ہوتی ہے۔ اس بہانے کراچی کا قیام طویل ہو جاتا ہے جس میں مقتدر علمی شخصیات سے بالمشافہ شرف استفادہ کے ساتھ ساتھ لائبریریوں میں محفوظ نوادرات سے خوشہ چینی کی نعمت غیر مترقبہ میسر آتی ہے۔

اب کے جانا ہوا تو اکادمی آف ایجوکیشنل ریسرچ (ادارہ تصنیف و تالیف) کراچی کی مطبوعہ رپورٹ متعلق اجلاس بست و ہشتم آل انڈیا محمدن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام راولپنڈی منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء (مطبوعہ بار دوم ۲۰۰۲ء) دستیاب ہوئی۔ ۴۳۱ صفحات پر پھیلی یہ مستند رپورٹ بے حد قیمتی دستاویز ہے۔ کانفرنس کا بڑا مقصد متحدہ ہندوستان کے تمام صوبجات میں انگریزی اور جدید تعلیم کے ادارے قائم کرنے کے ساتھ معیاری اسلامی تعلیم گاہوں کا قیام بھی تھا۔ اس کانفرنس میں (۳۱) رزولیوشن باتفاق آراء پاس ہوئے (رپورٹ صفحہ ۳)۔ اس رپورٹ میں سرحد اور پنجاب کے ہی نہیں ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے تعلیمی احوال اور ضروریات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

پیش نظر رپورٹ کے مطالعہ سے ایجوکیشنل کانفرنس کے ہمہ گیر اثرات کا پتا چلتا ہے۔ قارئین کرام کے لیے یقیناً آج یہ بات اچنبھے کی ہوگی کہ راولپنڈی اسٹیشن پر دوسرے ہم وطن افراد

(اہل ہنود وسکھ) کی بڑی تعداد موجود تھی جنھوں نے صاحب صدر اجلاس اور تمام مہمانوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا، پھول برسائے۔ شہر میں جا بجا ان کی طرف سے آرائشی دروازے بنائے گئے تھے۔ اور مہمانان گرامی کی پان، مصری، الائچی وغیرہ سے تواضع کی اور وہ کانفرنس کے تمام اجلاسوں میں برابر شریک رہے۔ صدر مجلس نے سکھ و ہندو صاحبان راولپنڈی کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا اور دعا کی کہ خدائے تعالیٰ تمام باشندگان ملک کو اسی قسم کی یک جہتی اور باہم ہمدردی کی توفیق عنایت کرے جس کے جواب میں بابا اوجاگر سنگھ صاحب بیدی، آنریری مجسٹریٹ وسول جج راولپنڈی نے حسب ذیل کلمات بطور اظہار تشکر ادا کیے۔

"فخر وطن پریزیڈنٹ صاحب و حاضرین جلسہ۔

مَیں مولوی صاحب سی۔ آئی۔ ای (خان بہادر سر رحیم بخش صاحب) کے اُن سنہری الفاظ کا (جو کہ آپ نے اہل ہنود و شہر راولپنڈی کے بارہ میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمائے ہیں) تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اے صاحبان آپ کی خدمت میں یہ ظاہر کر دینا ایک نئی بات نہیں ہے کہ ہمارے مذہب کے بزرگ "بانی" شری گورونانک دیو جی مہاراج کی پوتر ہدایت جو کہ انھوں نے ایک مرتبہ اپنی پرتھم یاترا کرتے ہوئے ایک قابل عزت قاضی صاحب سے تذکرہ ہونے پر فرمائی جبکہ قاضی صاحب کا یہ سوال تھا کہ اے بابا نانک! کہیے۔ ہندو اچھے ہیں یا کہ مسلمان۔ اس وقت آپ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا کہ

اول اللہ نور اُپایا، قدرت کے سب بندے
ایک نور نے سب جگ اُپجیا کون بھلے کون مندے

صاحبان آپ کو بخوبی روشن ہو گیا ہوگا کہ اہل ہنود وسکھ قوم کے واسطے اسی پوتر اُپدیش پر چلتے ہوئے یہ ایک عجیب بات نہیں ہے کہ وہ اپنے وطن کے رکن اور اپنی ہمسایہ قوم کے لیڈر کو جو کہ ان کے شہر میں تعلیم کی ترقی کے نیک کام کو مدنظر رکھ کر

تشریف لاتے ہیں ان کا خیر مقدم کہنے کے واسطے کیوں اسٹیشن پر حاضر نہ ہوتے......"

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے قائدین کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے اجلاس میں اختلافی اموراور ایسی تقاریر سے اجتناب کریں جن سے ملی یک جہتی کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو، تاہم ان موضوعات کو شرعی اور سیاسی بحث کے لیے دوسرے موقعوں پر اٹھا رکھا جاتا (رپورٹ ص ۱۹۰)۔

چوں کہ کوئی بھی قومی ادارہ یا کوئی بھی انجمن یا تنظیم روپے پیسے کے بغیر نہیں چل پاتی اس لیے کانفرنس کی جانب سے نہ صرف رؤسا، مخیّر اور فیاض اصحاب سے اپیل کی جاتی بل کہ علما اور مشائخ کی توجہ ان قومی تعلیم گاہوں کی طرف مبذول کروائی جاتی کہ وہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ رپورٹ کے صفحہ ۱۶۱ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان، آنریری جائنٹ سیکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس فرماتے ہیں۔

> ہم کو اپنی قوم کے مشائخ اور علما سے مدد لینا چاہیے کہ اس امر کا علی الاعلان فتویٰ دیں کہ اس ملک کے اسلامی باغ کے افراد کے دلوں دماغوں کو علم اور تربیت کے چشموں سے سیراب کرنا بہترین ذریعہ مغفرت اور حصول ثواب کا ہے نیز ہماری کانفرنسوں اور لوکل کمیٹیوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے حدود میں قوم کی موجودہ پستی اور اُس کے اسباب اور علاج کو افرادِ قوم کے ذہن نشین کریں یہ کانفرنس سالہا سال سے اس خدمت کو انجام دے رہی ہے لیکن ایک آواز اس قدر بڑے ملک اور قوم میں سب جگہ اور سب کے پاس کیسے پہنچ سکتی ہے؟ ہر جمعہ کو مساجد کے وعظوں میں ہر سال عیدین کے خطبوں میں، اجمیر شریف اور دیگر متبرک مقامات کے عرسوں میں غرض کہ ہر جگہ اور موقع پر جہاں مسلمان خود اپنے عقائد کی بدولت جمع ہوتے ہیں وہاں انھیں خیالات اور حالات کی اشاعت ہو۔

صاحبزادہ صاحب کی مندرجہ بالا اپیل کے تناظر میں اگر علامہ شبیر احمد خاں غوری کے

مضمون کا مطالعہ کرلیا جائے تو دلچسپی اور معلومات کا موجب ہوگا کہ مولانا سلیمان اشرف محولہ رپورٹ سے بہت پہلے اسی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ بے غرضی اور فروغ علم کے مشن کے لیے تن دہی کا جذبۂ خیر مولانا ہی کا حصہ ہے۔ غوری صاحب مرحوم رقم طراز ہیں۔

مسلم یونی ورسٹی میں اپنے فرائض منصبی کے دوران مولانا کے دینی وعلمی معمولات میں سب سے اہم مصروفیت ہر سال عرس کے موقع پر حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر حاضری اور وہاں میلاد خوانی تھی، مگر حضرت مولانا کی دینی غیرت کہ یونی ورسٹی سے مصارفِ سفر نہیں لیتے تھے اور نہ متولیٔ درگاہ سے یہ الگ بات کہ اس میلاد کے ذریعہ یونی ورسٹی کی کارکردگی اور پبلسٹی کے علاوہ اہل خیر کی جانب سے رقم کثیر یونی ورسٹی کے چندہ کے لیے دی جاتی تھی۔

مطبوعہ رپورٹ سے کچھ صفحات کے عکس بطور ضمیمہ کتاب کے آخر میں شامل کرتے ہوئے ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس عہد ساز کردار کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کہ "ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے اور انھیں جدید علم وفن سے واقف کرانے میں کانفرنس نے زبردست رول ادا کیا، آج کی نئی نسل اس عظیم تعلیمی، اصلاحی اور ثقافتی ادارے کے کارناموں سے قطعاً ناواقف ہے"۔ اور بقول امان اللہ خاں شیروانی، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلم نشاۃ الثانیہ کی تحریک میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ دراصل کانفرس ہی علی گڑھ تحریک ہے۔ یقیناً کانفرنس نے تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے سلسلہ میں مسلمانوں میں بیداری پیدا کی۔ اس عہد آفریں کانفرنس کی اہمیت اور قدر و قیمت اس کے شرکائے محترم کی عظیم شخصیات کے محض نام لینے سے اظہر من الشمس ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ کون کون نابغہ اس محفل کو رونق بخش رہا تھا۔ یہ ہیں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، صاحبزادہ سر عبدالقیوم بانی اسلامیہ کالج پشاور، مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، خواجہ کمال الدین۔

مولانا محمد علی جوہرؒ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس راولپنڈی ۱۹۱۴ء میں دیگر مندوبین کے ساتھ (بائیں سے دائیں کرسیوں پر): ۵ صاحبزادہ سر عبدالقیوم بانی اسلامیہ کالج پشاور ۲ مولانا ابوالکلام آزاد ۷ خواجہ کمال الدین ۸ مولانا محمد علی جوہر رحمتہ اللہ علیہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کارروائی اجلاس بست و ہشتم

آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس

منعقدہ بمقام راولپنڈی (پنجاب)

اجلاسِ اوّل

منعقدہ بتاریخ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۴ء یوم یک شنبہ بوقت دس بجے دن سے ایک بجے دن تک

پریزیڈنٹ

عالی جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ پریسیڈنٹ

کونسل آف ریجنسی ریاست بہاولپور

اجلاس کا وقت سابقاً آٹھ بجے تجویز ہوا تھا۔ مگر راولپنڈی کی سردی کا خیال کرکے وقت بدل دیا گیا اور دس بجے دن کا وقت مقرر کیا گیا۔ وقت مقررہ کے قبل ہی تمام وسیع پنڈال ممبران و وزیٹران سے

رپورٹ متعلق اجلاس بست و ہشتم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا صفحہ ۴۱
بمقام راولپنڈی ۱۹۱۴ء

پر ہو گیا تھا۔ ساڑھے تین سو سے زائد ممبر تقریباً پانسو وزیٹر اور ڈیڑھ سو کے قریب آنریری وزیٹر شریک اجلاس تھے باوجود سفر دور دراز و سخت سردی کے اکثر معززین و اکابرین قوم اس اجلاس میں تشریف فرما تھے یورپین اصحاب میں سے کرنل یوہم بنیک کمشنر راولپنڈی۔ سر جیرالڈ کنگسٹن کمانڈنگ آفیسر بریگیڈ راولپنڈی ڈویژن، صاحب ڈپٹی کمشنر راولپنڈی، مسٹر ایل ٹنگ صاحب ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج پشاور صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ پرنسپل صاحب مشن کالج نے اپنی شرکت سے اجلاس کو رونق بخشی۔ ماسوا یورپین حضرات کے اکثر برادران اہل ہنود و سکھ ہر اجلاس میں برابر شریک ہو کر کارروائی ملاحظہ کرتے تھے۔

ساڑھے دس بجے عالی جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب سی۔ آئی۔ ای پنڈال میں رونق افروز ہوئے۔ حاضرین نے تعظیماً سروقد استادہ ہو کر پرجوش نعرہ ہائے مسرت و چیرز کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ ڈائس پر ممبران ریسپشن کمیٹی اور دیگر معزز اصحاب تشریف رکھتے تھے جن میں سے چند بزرگوں کے اسمائے گرامی ذیل میں درج ہیں:۔

۱۔ عالی جناب نواب کپتان ملک محمد مبارز خاں صاحب ٹوانہ رئیس شاہ پور
۲۔ عالی جناب آنریبل محمد امین صاحب رئیس ضلع کیمبل پور
۳۔ عالی جناب صاحبزادہ عبدالقیوم خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای
۴۔ عالی جناب جنرل عبدالرحمٰن خاں صاحب بہاولپور
۵۔ عالی جناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی رئیس علی گڑھ
۶۔ عالی جناب آنریبل سید رضا علی صاحب وکیل مراد آباد
۷۔ عالی جناب مسٹر محمد علی صاحب بی۔ اے (آکسن)
۸۔ عالی جناب مسٹر شوکت علی صاحب بی اے
۹۔ عالی جناب مولوی ابوالکلام صاحب آزاد دہلوی
۱۰۔ عالی جناب مولوی عبیداللہ صاحب ناظم نظارت المعارف القرآنیہ دہلی
۱۱۔ عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اردو
۱۲۔ عالی جناب مسٹر ایل ٹینگ صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج پشاور
۱۳۔ عالی جناب مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر اخبار البشیر اٹاوہ

۱۴- عالی جناب میر نثار حسین صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ علی گڑھ۔
۱۵- عالی جناب مولوی سلیمان اشرف صاحب پروفیسر دینیات مدرسۃ العلوم علی گڑھ
۱۶- عالی جناب مولوی الف دین صاحب ہیڈ کیمبل پور
۱۷- عالی جناب مولوی نثار علی صاحب سیکٹر مدارس لاہور سرکل

آغازِ کارروائی

دس بجکر ۴۵ منٹ پر جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے اول مولوی سلیمان اشرف صاحب پروفیسر دینیات مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے تیمناً و تبرکاً قرآن کریم کی چند آیات خوش الحانی کے ساتھ تلاوت فرمائیں۔ دورانِ تلاوت میں جملہ حاضرین تعظیماً استادہ رہے۔ اس کے بعد جناب لاکپتان ملک محمد مبارز خاں صاحب ٹوانہ رئیس شاہ پور نے بحیثیت پریسیڈنٹ استقبالی کمیٹی اپنا مطبوعہ ایڈریس پڑھا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

ایڈریس پریزیڈنٹ صاحب ریسپشن کمیٹی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

راولپنڈی

حضرات! سب سے پہلے مجھے استقبالیہ کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے کہ کمال مہربانی سے مجھے کمیٹی کا پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی مجھے اپنے اِن مکرم و معزز احباب کا جو استقبالیہ کمیٹی کے ممبر ہیں آپ حضرات کے سامنے شکوہ بھی کرنا ہے کہ انہوں نے میرے انکار پر جو میں نے اس جلیل القدر منصب کے قبول کرنے سے بار بار اُن کے سامنے پیش کیا مطلق التفات نہ کی اور مسلسل طور پر اصرار کرنے سے مجھے اس خدمت کو اپنے ذمہ لینے پر مجبور کیا۔ بلاشبہ یہ امر میرے لئے نہایت فخر اور شکرگذاری کا موجب ہے اور میں سچے دل سے اس عزت کی قدر کرتا ہوں۔ میرا انکار اس بنا پر نہیں تھا کہ ایک قومی خدمت کے ادا کرنے میں مجھے تامل تھا۔ میرے انکار کی اصلی وجہ یہ تھی کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی اس عظیم الشان قومی تعلیمی مجلس کی استقبالیہ کمیٹی کا پریزیڈنٹ ہونے کا اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے میں اپنے آپ کو اہل

نہیں سمجھتا تھا اور اب جب میں اپنے آپ کو اپنی قوم کے تعلیم یافتہ اصحاب علما کی اس محترم مجلس کے سامنے کھڑا ہوا دیکھتا ہوں۔ تو اپنی حالت کو اس قطرہ باراں کی مانند پاتا ہوں جس کو سمندر میں جا کر گرنے کی ہدایت کی جاتی ہو اور اپنی بے مائگی کو اور بھی زیادہ محسوس کرتا ہوں، بایں ہمہ میں اپنی اس خوش قسمتی کا ممنون احسان ہوں۔ کہ جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے وہ آسان ہونے کے ساتھ ہی انتہا درجہ خوش گوار ہے کہ مجھے آپ صاحبان کا آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اٹھائیسویں اجلاس میں راولپنڈی تشریف فرما ہونے پر آپ کا خیر مقدم کہنا ہے اور آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ پس میں نہایت مودبانہ طور پر اور نہایت صدق اور جوش کے ساتھ اپنا اور مسلمانان قسمت راولپنڈی کا دلی خیر مقدم آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ باقی رہا آپ کا شکریہ ادا کرنے کا سوال۔ اس کی نسبت میں چند الفاظ گزارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کی یہ بزرگ تعلیمی مجلس اس سے پیشتر ۲۷ اجلاس ہندوستان کے مختلف مقامات پر کر چکی ہے۔ لیکن ان تمام مقامات میں جیسے کہ دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی اور کراچی وغیرہ میں کچھ تاریخی یا مقامی دل چسپیاں اور دل فریبیاں بھی موجود تھیں اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ خاص اسباب بھی ممبران کانفرنس کو ان مقامات کی طرف کشش کرنے کا باعث ہوئے ہونگے لیکن راولپنڈی کسی ایسے قسم کی دلکش خصوصیت سے خالی ہے۔ اور اگر اس میں کوئی امتیاز ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی ایک ایسی کثیر آبادی کا مرکز ہے جہاں جہالت اور بے علمی کی گہری تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ قسمت راولپنڈی کی آبادی کی کیفیت کو ملاحظہ فرمایئے۔ تمام ڈویژن میں ۳۳ لاکھ کی آبادی ہے جن میں سے ۲۹ لاکھ مسلمان ہیں۔ اسی طرح ہماری ہمسایہ قسمت ملتان میں ۳۸ لاکھ میں سے ۳۰ لاکھ مسلمان ہیں۔ گویا برٹش پنجاب کے مسلمانوں کی ایک کروڑ ۹ لاکھ کی آبادی میں سے ۶۰ لاکھ مسلمان ان دونوں قسمتوں میں آباد ہیں پھر ہمارے ڈویژن کے ایک جانب صوبہ سرحدی ہے۔ جہاں قریب قریب تمام مسلمان آباد ہیں اور دوسری جانب ریاست کشمیر ہے۔ جس میں تقریباً ۹۵ فی صدی مسلمانوں کی آبادی ہے۔ لیکن ان علاقہ جات کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت نہایت درد ناک طور پر پست ہے جس کی تفصیلات آپ کو اپنے اجلاس کی کارروائیوں کے دوران میں معلوم ہونگی، مگر جہاں ہمارے علاقہ اور ہمارے ہمسایہ سرزمین میں جیسے کہ میں نے کہا ہے، جہالت اور بے علمی کا امتیاز ہے۔ وہاں آپ کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اس تمام علاقہ کے مسلمان باشندگان کو قدرت نے جو جسمانی اور دماغی خصوصیات عطا فرمائی ہیں ان کے لحاظ سے بھی وہ ایک خاص حق امتیاز رکھتے ہیں۔ آپ صاحبان کو معلوم ہو گا کہ

ہماری سلطنت کی افواج قاہرہ میں مسلمان سب سے زیادہ راولپنڈی ڈویژن اور صوبہ سرحدی کے ہیں۔ اور اسی طرح کشمیری دماغوں کے جوہر کسی سے مخفی نہیں ہیں پس جس قدر کہ اس علاقہ کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت ردی ہے اور جس قدر کہ اس نوع کے مسلمان تعلیم وتربیت سے قوم کے لئے مفید افراد بنائے جاسکتے ہیں۔ اسی قدر آپ صاحبان کا جو اس حصہ ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کرنے اور ان کی ترقی تعلیم کی تدابیر سوچنے کے لئے تشریف لائے ہیں، ہمارے شکریہ اور احسانمندی پر زیادہ حق ہے۔ درحقیقت کانفرنس کا یہ اجلاس جو راولپنڈی جیسے مقام پر منعقد ہوا ہے جہاں سردی زیادہ ہے اور اس کے ایک گوشہ ملک میں واقع ہونے کی وجہ سے سفر کی تکلیف بھی زیادہ برداشت کرنی پڑتی ہے تعلیم یافتہ مسلمانان ہندوستان کی قومی ہمدردی کے امتحان کا ایک موقع ہے اور اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ قوم میں ایسے پاک اور ہمدرد نفوس کس قدر ہیں جو ایک ایسے مقام پر جہاں سیر وتفریح کا کوئی سامان کشش کرنے والا نہیں ہے محض اپنے پس ماندہ بھائیوں کی بھلائی کی خاطر بہت سی تکالیف برداشت کرنے کے لئے تیار ہو کر آئے ہیں۔ خداوند کریم آپ کو اس کی جزائے خیر دے۔

اے صاحبان! آفتاب جب نکلتا ہے، تو نہ صرف پہاڑوں اور میدانوں ہی کو روشن کرتا ہے۔ بلکہ غاروں اور خندقوں میں بھی روشنی پہنچاتا ہے، اور اس دفعہ اگر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آفتاب نے اپنی پوری روشنی ڈالنے اور گرمی کا فیض پہنچانے کے لئے ہماری اس تاریک اور سرد سرزمین کو منتخب کیا ہے تو ہم اس احسان کی وسعت اور عظمت کو بخوبی سمجھتے ہیں، اور اس کا کافی شکریہ نہیں ادا کر سکتے، جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے عملی کام کچھ نہیں کیا وہ صرف اتنی بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بیج ڈالنے سے پہلے زمین کو تیار کرنا ضروری ہے، اور یہی سب سے زیادہ محنت کا اور دشوار کام ہے۔ ہم کو اس امر میں کچھ شک نہیں ہے کہ جہاں جہاں قوم کی تعلیم کی کھیتیاں اچھی طرح بارآور ہو رہی ہیں، وہ زمینیں کانفرنس ہی کے تردد سے تیار ہوئی ہیں، اور ہم کو یقین ہے کہ ہماری خوش قسمتی سے اس دفعہ ہماری سرزمین کی باری آئی ہے اور اگر ہماری زمین اچھی ہے، تو خدا کی مہربانی سے آپ دیکھیں گے کہ یہ کھیتیاں کیسا اچھا پھل لائیں گی اور کانفرنس کی یہ مساعی کیسی مشکور ثابت ہونگی۔

ہمارے حکام عالی مقام نے کانفرنس کے اس اجلاس کے متعلق جو دلی ہمدردی اور مہربانی کا اظہار فرمایا ہے اس کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ہمارے ذمہ لازمی ہے۔ ہم نے عالی جناب ہز آنر نواب لفٹننٹ گورنر

بہادر پنجاب کی خدمت بابرکت میں اجلاس کانفرنس میں رونق افروز ہونے کی گزارش کرنے کے لئے عریضہ پیش کرنے کی جسارت کی تھی جس کے جواب میں جناب ممدوح کے پرائیویٹ سکرٹری صاحب بہادر نے حسب ذیل نوازش نامہ تحریر فرمایا ہے کہ " میں نے آپ کے عریضہ مورخہ ۱۰ر دسمبر کو ہز آنر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اس کے جواب میں جناب موصوف نے اس امر کی آپ کو اطلاع دینے کی ہدایت فرمائی ہے کہ ہز آنر آپ کی دعوت کی دل سے قدر فرماتے ہیں، اور کانفرنس کی کارروائیوں کو جس کی اغراض کے ساتھ ان کو ہر ایک قسم کی پوری ہمدردی ہے، گہری دلچسپی سے ملاحظہ فرماتے رہیں گے۔ لیکن جناب ممدوح کو افسوس ہے کہ کرسمس کے ہفتہ کی لاہور کی سابقہ طے شدہ مصروفیات کی وجہ سے ہز آنر اجلاس کانفرنس میں شرکت نہیں فرما سکیں گے۔"

جناب کرنل پوپہم ینگ صاحب بہادر سی۔ آئی۔ ای کمشنر راولپنڈی ڈویژن نے صرف اجلاس کانفرنس کو اپنی شمولیت سے زینت بخشنے ہی کا وعدہ نہیں فرمایا، بلکہ کمال مہربانی سے ممبران کانفرنس سے ملاقات کرنے کے لئے ان کو اپنے دولت خانہ پر گارڈن پارٹی کے لئے مدعو فرمایا ہے۔ جناب مسٹر رینوف صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر اور مسٹر جزلم صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ پولیس راولپنڈی نے نہایت ہمدردی سے ہر طرح کی امداد فرمائی ہے، اور ایسے ہی اعلیٰ افسران فوج مثلاً جنرل سر جی گلشن صاحب بہادر کمانڈنگ سیکنڈ (راولپنڈی) ڈویژن اور دیگر اصحاب مثلاً کرنل ایلیرڈ صاحب بہادر اسسٹنٹ ڈائرکٹر سپلائی و ٹرانسپورٹ و میجر بروننگ صاحب بہادر کنٹونمنٹ مجسٹریٹ نے بڑی کشادہ دلی سے ہم کو بہت قیمتی مدد دی ہے، اور ان سب اصحاب کا میں اپنی اور ریسپشن کمیٹی کی جانب سے تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں ایک بڑی فروگذاشت کے گناہ کا مرتکب ہونگا اگر اس موقع پر میں اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں اور پادری صاحبان اور افسران سررشتہ تعلیم کا شکریہ خاص طور پر ادا نہ کروں۔ ہمارے مہمانوں کے قیام کے لئے ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول، مشن ہائی اسکول، خالصہ ہائی اسکول، ڈینیس ہائی اسکول، گورنمنٹ ہائی اسکول اور نارمل اسکول کی عمارتیں استعمال کے لئے ہمارے حوالہ کر دی گئی ہیں، اور جس شوق اور محنت سے ہمارے ہندو عزیز کام کر رہے ہیں، اور کل ریلوے اسٹیشن پر اور شہر میں ہماری کانفرنس کے محترم پریذیڈنٹ صاحب کے استقبال میں جس جوش اور ہمدردی سے ہمارے ہندو بھائیوں نے حصہ لیا ہے، اس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

مجھ کو اپنے دوست رائے صاحب ڈاکٹر ان ان دت صاحب کا بھی خاص شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اپنی خدمات طبی امداد کے لئے بلا معاوضہ ممبران کانفرنس کی نذر کی ہیں۔

مجھ کو اندیشہ ہے کہ میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت لے لیا ہے۔ پس میں اپنے مسلمان بھائیوں اور ممبران استقبالیہ کمیٹی اور دیگر اصحاب کا شکریہ ادا کرنے کے کام کو آپ کی کمیٹی کے سکرٹری کے ذمے چھوڑتا ہوں، اور آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ خداوند کریم و رحیم کا نام لے کر آپ اپنے کام کو میری اس دعا کے ساتھ شروع فرمائیں کہ وہ مجیب الدعوات آپ کی ان مساعی حسنہ میں برکت بخشے، اور آپ کی امیدوں سے بڑھ کر ان کو کامیاب ثابت کرے۔

ایڈریس ختم کر کے ملک صاحب ممدوح نے مناسب الفاظ میں تحریک کی کہ جناب والا حاجی رحیم بخش صاحب پریسیڈنٹ کونسل بہاولپور اجلاس کانفرنس کے صدر منتخب کئے جائیں۔ جناب حاجی شمس الدین صاحب سکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور نے اس تحریک کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"ہمارے محترم بزرگِ قوم جناب ملک صاحب نے انتخاب صدر کی جو تجویز پیش کی ہے وہ نہایت"
"مبارک و مستحسن ہے۔ جناب مولانا حاجی رحیم بخش صاحب ایک ایسے مشہور ہمدردِ قوم بزرگ ہیں کہ جن کے"
"اوصاف حمیدہ کا تذکرہ آپ صاحبان کے سامنے کرنا تحصیل لاحاصل ہے۔ آپ کی ذات بابرکات"
"مسلمانوں کے لئے مغتنمات میں سے ہے۔ جناب ممدوح کو مسلمانوں کی عام بہبودی کے کاموں کے"
"ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ بالخصوص گہری ہمدردی اور دلچسپی ہے، اور جس علو ہمتی"
"کے ساتھ جناب ممدوح قومی بہبود کے کاموں میں معاونت فرماتے ہیں وہ سب پر روشن ہے۔ ان"
"تمام امور کے لحاظ سے ہمارے لئے موجب فخر ہے کہ ایسے بزرگِ قوم اس کانفرنس کے صدر منتخب ہوں۔"
"حاجی صاحب موصوف نے جس قدر مالی مدد اس وقت تک مختلف انسٹی ٹیوشنز کی اپنی ذات خاص"
"سے کی ہے یا اسلامی ریاست سے دلائی ہے وہ ہر طرح سے قابل تحسین و لائق آفرین ہے۔ میں یقین کرتا"
"ہوں کہ آپ صاحبان میری اس امید کے ساتھ شریک ہونگے کہ جناب حاجی صاحب کی توجہ سے"
"آئندہ اس سے بڑھ کر قومی کاموں میں امداد ملتی رہیگی۔ چونکہ اب کانفرنس کا کام شروع کرنا ہے"
"اس لئے میں اس دعا کے ساتھ اس تحریک کی تائید کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ ممدوح کو عمر دراز عطا"

"فرمائے اور درخواست کرتا ہوں کہ جناب ممدوح کرسی صدارت پر رونق افروز ہوں ...."

جملہ حاضرین نے انتخاب صدر کی تجویز کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول کیا اور جناب حاجی صاحب موصوف نے چیرز کی آوازوں میں صدارت کی کرسی کو زینت بخشی۔ اس موقع پر منشی غلام محمد صاحب خادم کشمیری نے دو رباعیاں پڑھیں جن میں سے ایک رباعی ذیل میں درج ہے:-

آغاز ترے نام پہ ہو اے رحیم بخش — درماندہ اس گروہ پہ فیض عمیم بخش

دنیا میں ہم کو علم کی دولت سے کر نہال — اور عاقبت میں بخشش جنت نعیم بخش

حاضرین رباعی کا لطف حاصل کر ہی رہے تھے کہ واجب الاحترام صاحب صدر انجمن اپنا ایڈریس پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے اور ایڈریس کے زبان انگریزی میں ہونے کی معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"حضرات! اگرچہ میرے دوست صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور قاضی سراج الدین احمد"
"صاحب نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میرا ایڈریس اردو میں ہو۔ اور غالباً اس وجہ سے کہ میں نے یہ"
"ایڈریس انگریزی میں لکھا ہے یہ صاحبان ناراض ہونگے لیکن میں معافی چاہتا ہوں کہ خاص مصلحت سے"
"مجھے ایسا کرنا پڑا۔ ایسی شاندار کانفرنس کے لئے ایڈریس انگریزی میں ہونا ضروری تھا مگر میں آپ"
"صاحبان سے عرض کرونگا کہ بوجہ کم علمی کے جو غلطیاں مجھ سے سرزد ہو جاویں آپ معاف فرمائینگے"
"میں نے انگریزی بڑھاپے میں پڑھی ہے۔ مگر شکر کرتا ہوں کہ بوڑھا طوطا بھی نہیں ہوں....."

انگریزی ایڈریس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

ترجمہ تقریر صدارت ؎

خواتین و حضرات!

ایسے لمحے بھی انسان کی زندگی میں آتے ہیں جبکہ اس کو اس کام یا فرض کی انجام دہی کے متعلق جو اس پر عائد ہوتا ہے اپنی دماغی ناقابلیت کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اس وقت میرے اوپر بھی ایسا یا تقریباً ایسا ہی احساس غالب ہے۔ اس پنڈال میں جو سر سید احمد جیسے نیک نہاد و عاقل و فرزانہ، نواب محسن الملک جیسے روشن دماغ فصیح و بلیغ، رائٹ آنریبل سید امیر علی جیسے برگزیدہ فرزند ہند و ممتاز مقنن، مولوی نذیر احمد صاحب جیسے جید عالم، نواب عماد الملک جیسے فاضل و اہل الرائے اور ہمارے پنجاب کے

؎ یہ تقریر کتاب ھذا کے صفحات ۱۳۳ تا ۱۶۰ پر موجود ہے۔

اجلاس دوم

یوم یک شنبہ بتاریخ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۴ء وقت ۳ بجے سہ پہر سے ۵ بجے تک

زیر صدارت عالی جناب خان بہادر حاجی مولوی رحیم بخش صاحب سی۔ آئی۔ ای

آنریبل مسٹر جسٹس شاہ دین صاحب آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب اور حاجی مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار کے تار آنریری جائنٹ سکریٹری کانفرنس نے جلسہ میں پڑھکر سنائے جن میں عدم شرکت اجلاس کانفرنس پر افسوس اور کانفرنس کے اجلاس کی کامیابی کی دعا کی گئی تھی۔ نیز ہز آنر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کے پرائیویٹ سکریٹری کی چٹھی بھی پڑھی جس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

گورنمنٹ ہاؤس، لاہور

مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۴ء

مہربان من - میں نے آپکی چٹھی مورخہ ۹ ماہ حال حضور لفٹنٹ گورنر بہادر کے ملاحظہ میں پیش کی جس کے جواب میں مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں آپ کو مطلع کروں کہ ہز آنر ممدوح آپکے دعوت نامہ پر اظہار خوشنودی فرماتے ہیں حضور ممدوح کو کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے ساتھ کمال ہمدردی ہے اور اس کی کارروائیوں کو بغایت دلچسپی ملاحظہ فرمائینگے لیکن افسوس ہے کہ تعطیلات کرسمس کے موقع پر چونکہ سابق کی قرارداد مصروفیات ہیں اس لئے ممدوح اجلاس کانفرنس میں شریک نہ ہو سکینگے۔

آپکا وفادار

ایس۔ سی۔ بیلی

لفٹنٹ کرنل (دستخط)

پرائیویٹ سکریٹری

اجلاس سوم

یوم یکشنبہ بوقت ۸ بجے شب

زیر صدارت مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی

آنریری جائنٹ سکرٹری نے بیان کیا کہ اس جلسہ کیلئے مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی صدر تجویز ہوئے ہیں لیکن وہ ابھی تک تشریف نہیں لائے اور وقت ہوگیا ہے اس لئے میں استدعا کرتا ہوں کہ مولوی بشیر الدین صاحب اس جلسہ کے صدر قرار دیئے جائیں۔ بریلنے اس تحریک کی تائید کی اور مولوی صاحب موصوف صدر جلسہ ہوئے۔ اس کے بعد جناب مولوی عبید اللہ صاحب ناظم نظارۃ المعارف دہلی نے تقریباً ایک گھنٹہ تک وعظ فرمایا۔

مولانا موصوف کا وعظ ختم ہونے پر مسٹر شوکت علی صاحب نے مولانا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک جوشیلی تقریر کی اور اثناء تقریر میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا جو آنریری جائنٹ سیکرٹری کانفرنس کی رائے میں کانفرنس کے پلیٹ فارم کے موزون نہ تھے۔ اس لئے آنریری جائنٹ سیکرٹری نے صاحب صدر جلسہ سے درخواست کی کہ مسٹر موصوف کو اس قسم کی تقریر سے روکا جائے اور عرض کیا کہ اگر نہ روکا گیا تو اس کی ذمہ داری اُن پر ہوگی۔ اسی عرصہ میں جناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی رئیس بھیکم پور (علی گڑھ) تشریف لے آئے جو لٹریری سیکشن کے اجلاس کی صدارت فرمانے والے تھے۔

مولوی بشیر الدین صاحب صدر جلسہ خان صاحب ممدوح کی تشریف آوری پر کرسیٔ صدارت سے علٰحدہ ہو گئے۔ اور اس طرح جو کارروائی اس وقت ہو رہی تھی وہ ختم ہو گئی۔

مولانا ممدوح کے کرسیٔ صدارت پر تشریف فرمانے کے بعد اول مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اردو نے انجمن کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی جو حسب ذیل ہے:۔

اجلاس چہارم

منعقدہ بتاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۴ء دس بجے دن سے ایک بجے دن تک

زیر صدارت عالی جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب سی۔آئی۔ای۔

سب سے پہلے حافظ محمد سعید صاحب نے کلام پاک کی ایک سورۃ خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کی۔ اسکے بعد صاحب صدر نے ضیق وقت کی وجہ سے یہ قرار دیا کہ رزولیوشن کے محرکین کو دس منٹ اور موئیدین کو ۵ منٹ تقریر کے لئے دیے جاتے ہیں اور مولوی بشیر الدین صاحب کو پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ متحدہ کی رپورٹ پڑھنے کیلئے آدھ گھنٹہ دیا جائے اور فرمایا کہ "مقررین اپنے موضوع سے تجاوز نہ فرمائیں گے علاوہ ازیں دو باتوں کا خاص طور سے لحاظ رکھا جائیگا۔ اول یہ کہ اگرچہ کانفرنس ایک اسلامی انجمن ہے لیکن یہاں شرعی فتاوٰی کی بحث کا ہرگز موقع و محل نہیں ہے۔ اس قسم کی بحث دوسرے مناسب موقع پر ہونا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ کانفرنس ایک تعلیمی مجلس ہے اسلئے پالیٹکس اور سیاسیات کے متعلق بھی کچھ نہ کہنا چاہئے اور نہ کوئی ایسی بات ہونا چاہیئے کہ جسکی وجہ سے اختلافات پیدا ہوں کانفرنس اپنے دائرۂ عمل کے اندر نہایت مفید تعلیمی خدمت انجام دے رہی ہے اور جہاں جہاں اسکے اجلاس ہوتے ہیں وہاں کے مسلمانوں میں تعلیمی تحریک کو بہت کچھ تقویت پہونچی ہے۔ اسلئے کانفرنس میں ایسے خیالات کا اظہار نہ ہو جس سے اختلافات پیدا ہوں اور جو موقع ہمکو اپنی حالت پر تبادلہ خیالات اور ضروری کارروائیوں کا ملتا ہے وہ ہاتھ سے نہ جاتا رہے جو کام ہمکو آج کے پروگرام کے لحاظ سے درپیش ہیں انکو باحسن وجوہ انجام دینا چاہیئے۔ کوئی صاحب برائے مہربانی کسی مقررہ کارروائی کے علاوہ کسی جدید امر کے پیش کرنے کی اجازت نہیں دیجاتی۔ جو کام آج کے لئے قرار دیا گیا ہے وہی ہونا چاہیئے پس اب میں مولوی بشیر الدین صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی رپورٹ پڑھکر سنائیں"

چنانچہ مولوی بشیر الدین صاحب بحیثیت سکرٹری پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صوبجات ممالک متحدہ اپنی رپورٹ پڑھنے کیلئے اٹھے لیکن قبل اسکے کہ موصوف رپورٹ پڑھنا شروع کریں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مولوی صاحب موصوف کا حاضرین جلسہ سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "یہ وہ بزرگ ہیں جنکی تنہا کوشش اور جانفشانی کی بدولت اٹاوہ میں مسلمانوں کی مشہور درسگاہ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ قائم ہوا اور جس میں علاوہ اس صوبہ کے تقریبًا تمام صوبوں کے طالبعلم تعلیم پاتے ہیں مولوی صاحب موصوف جس خلوص اور جس ایثار سے کام کرتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں انہوں نے مسلمانوں کے تعلیمی معاملات پر غور کرنے میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے اور جو رپورٹ وہ پڑھکر سنائینگے وہ خاص توجہ کے قابل ہوگی"

خان بہادر مولوی بشیر الدین

اجلاس پنجم

یوم دوشنبہ بتاریخ ۲۸ دسمبر ۱۹۱۴ء وقت ۸ بجے شب سے ۱۱ بجے شب تک

کارروائی اجلاس اسکول سیکشن

زیر صدارت جناب خان بہادر صاحبزادہ عبدالقیوم خانصاحب سی ایس آئی

کارروائی اجلاس شروع ہونے سے قبل خواجہ عبدالصمد صاحب ککرو رئیس بارہ مولا کشمیر نے ایک مختصری تمہید کے ساتھ حمد و نعت مین ایک نظم (جسکو حاضرین نے دلچسپی سے سنا) پڑہی۔

چونکہ صاحبزادہ عبدالقیوم خاں صاحب جو اسکول سیکشن کے اس اجلاس کی صدارت فرمانے والے تھے پشاور سے اجلاس شروع ہونیکے وقت تک تشریف نہین لاسکے اسلیے حسب تحریک صاحبزادہ آفتاب احمد خان جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے۔ اور مندرجہ ذیل رزولیوشن پاس ہونے سے کارروائی اجلاس شروع ہوئی۔

رزولیوشن نمبر ۱

اس کانفرنس کی رائے ہے کہ ہر قسم کے کارخانہ دار اپنے اپنے کارخانون مین ایک ایک ٹرننگ کلاس جاری کرین اور اس مین مسلمان نوجوانون کو عملی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیں اور جس قدر اور جس حیثیت کا کام امید وار انجام دیں انکے موافق انھین معاوضہ دیں۔ اس میں کارخانہ دارون کا بھی فائدہ ہے اور متلاشی روزگار مسلمانون کے لیے ایک وسیع اور مفید ذریعہ پیدا ہو جائیگا۔

اصل محرک رزولیوشن کی عدم موجودگی کیوجہ سے جناب غلام حسین خاں صاحب ساکن راولپنڈی نے رزولیوشن کی تحریک کو مختصراً یہ بیان کیا کہ مسلمانون کے بالعموم صنعت و حرفت کے مفید پیشہ کی طرف سے

اجلاس ششم

یوم شنبہ بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء شروع وقت ۱۰ بجے دن سے ایک بجے تک

زیر صدارت عالیجناب خان بہادر حاجی مولوی رحیم بخش صاحب سی آئی ای

چونکہ کارروائی اجلاس کے شروع ہونیکا وقت ہو چکا تھا اور صاحب صدر جلسہ تشریف نہیں لائے تھے اسلئے حسب تحریک صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے اور حسب ارشاد جناب صدر جلسہ مولوی انیس احمد صاحب بی اے (علیگ) نے جو بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مدرسہ عالیہ دیوبند اور نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں عرصہ تک قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں "تعلیم القرآن" پر اپنا لیکچر پڑھ کر سنایا۔ یہ لیکچر جس جامعیت سے لکھا گیا تھا اور جس پایہ کا تھا وہ خود لیکچر سے واضح ہے تمام حاضرین اس لیکچر کو سنکر نہایت محظوظ ہوئے۔ یہ لیکچر بہ تمام وکمال ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

گزشتہ کانفرنس منعقدہ آگرہ میں خاکسار نے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں زیادہ تر ان دو امور پر بحث کی گئی تھی کہ ہماری قوم کے جدید طبقے میں مذہبی تعلیم کی کس حد تک ضرورت ہے اور اُس طبقے کی مذہبی تعلیم کے لئے کس قسم کے معلموں کی ضرورت ہے۔

اس مرتبہ ہماری مذہبی کتاب قرآن مجید کی تعلیم کے متعلق اپنی رائے عرض کرونگا۔ فقط اس قرآن کی تعلیم کا اثر تھا کہ چند سال کے عرصہ میں عرب کے بت پرست جاہل لوگ دنیا میں سب سے زیادہ خدا پرست، سب سے زیادہ متمدن، سب سے زیادہ تہذیب یافتہ اور سب سے زیادہ طاقتور بن گئے۔

اجلاس ہفتم

یوم شنبہ بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء وقت ½ ۲ بجے دن سے ½ ۴ بجے تک

زیر صدارت عالی جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب سی۔آئی۔ای

صدر انجمن صاحب کے کرسی صدارت پر رونق افروز ہونے کے بعد مولوی الف دین صاحب نے باجازت صاحب موصوف نظم ذیل پڑھکر سنائی جس نے خاص لطف پیدا کیا۔

نظم خطاب بہ مسلم

مسلمانو! کہاں اب ہیں وہ عظمت کے نشاں باقی — سبق آموز عبرت ہے تمہاری داستاں باقی

نہ وہ محفل، نہ وہ ساماں، نہ وہ میخوارگاں باقی — نہ وہ مینا، نہ وہ ساغر، نہ وہ پیر مغاں باقی

ہوئی چشم زدن میں بزم اخوان الصفا برہم — نہ اب وہ شمع ہے روشن، نہ وہ پروانگاں باقی

دل پر داغ ہے اک یادگار محفل رنگین — عوض مینا کے رہتی ہے یہ چشم خونچکاں باقی

رہا ہے ہمنشینو! یادگار صحبت عشرت — خمار بادۂ دوشینہ سے اک سرگراں باقی

ہوئی وہ بزم کیوں برہم، نکمے ہو گئے کیوں ہم — بپا کیوں ہے یہ ماتم، اور کیوں آہ و فغاں باقی

سبب اس کا تو ہے ظاہر کہ قرآں طاق نسیاں ہے — پکارے ہو کر اب میرا نہیں کوئی قدرداں باقی

وہ روح وحدت انساں کہ جس کو لایا تھا میرا نبی — نہیں اسے نام کے مسلم کہیں اس کا نشاں باقی

یہ شیعی ہے وہ ہے سنی یہ رافضی ہے وہ ہے ناصب — نہیں ہے وحدت ملت ترا نام و نشاں باقی

کبھی تھا اتحاد باہمی سرمایۂ نازش — مگر اب رہ گئیں ہے لے دے کے خانہ جنگیاں باقی

اتر نا ساحل مقصود پر دشوار ہے اپنا — خلیج شیعی و سنی ہے جب تک درمیاں باقی

بہت ہوں گے خدا حافظ ہمارا و میرزا پیدا — رہا گر ادعائے مہدیٔ آخر زماں باقی

ہے جب واحد خدا لئے قبلہ پیغمبر و قرآں — رہیں پھر کیوں مسلمانو! یہ فرقہ بندیاں باقی

کبھی ہم پیشرو روئے زمین پہ تھے تمدن کے
ہیں اب تک رہگذاروں پر نشان کارواں باقی

اگر چین میں ابی کشتہ ہیں تو اندلس میں طارق
ہے ذکر ابن قاسم سندھ میں ورد زبان باقی

زمانے پر عیاں ہے رفعت مینار دلی سے
زمین ہند میں اسلام کا ہے آسماں باقی

وہ تاج آگرہ ممتاز عالم اپنی خوبی میں
مجسم ہے سراپا حیرت نظارگاں باقی

اِدھر جو بی ہمالہ کی اُدھر پیرنیز کی وادی
شکوہ سطوت اسلام کے ہیں ترجماں باقی

اشداء علی الکفار یہ تھے رحمدل باہم
تمہاری نرمی و گرمی سے تھا نظم جہاں باقی

جب اس نرمی و گرمی پہ حکومت تھی فراست کی
تھے اقلیم سیاست میں تمہیں تم حکمراں باقی

تھا قرآن ہاتھ میں تکبیر لب پر درد سینے میں
نہ تھا روئے زمین پہ کوئی اپنا ہمعناں باقی

جھکا اللہ کے آگے جھکایا ساری دنیا کو
یہ راز عظمت مسلم تھا سجدہ میں نہاں باقی

کمال عبدیت میں تھا جلال سلطنت مضمر ـ
یہ نکتہ سیرت احمد سے ہی یکسر عیاں باقی

یہودی ہیں کہ نصرانی برہمن ہیں کہ زرتشتی
سیہ ہیں سب نعمت اسلام کے متلاشیاں باقی

کوئی دن میں یہ سارے جذب ہو جائینگے وحدت میں
رہیگا سکہ توحید عالم میں رواں باقی

تو اے دین الٰہی کاشف اسرار فطرت ہے ـ
رہیگا تیرے قبضہ میں ہمیشہ ملک جاں باقی

گل توحید قرآن سے معطر ہے مشام جان
رہیگی باغ احمد میں بہار بے خزاں باقی

الٰہی کیا ہوا وہ اعتصام عروۃ الوثقیٰ ـ
کہ ہے اب منتشر شیرازۂ اسلامیاں باقی

نہ وہ مومن نہ وہ ایماں نہ وہ مسلم نہ وہ عرفان
یونہی ہیں پیکر بے جان بدست زندگاں باقی

نہ ساجد ہیں نہ ہیں راکع نہ قاعد ہیں نہ ہیں قایم
نہ سر اندازیاں باقی نہ سر افرازیاں باقی

جمود عام ہے طاری نہیں تیزی نہ ناخوں میں
نہ دل میں نرمیاں باقی نہ خوں میں گرمیاں باقی

نہ سر سید کی دلسوزی نہ مہدی کی دل افروزی
نذیر خوش بیاں باقی نہ شبلی نکتہ داں باقی

ہے گلدستہ رنگیں سے اک شیریں بیاں حالی
سو ہیں یہ اک گل پژمردہ یادگلستاں باقی

الٰہی دیر تک محفوظ رکھیو دست گلچیں سے
کہ ان کے بعد یاں خالی ہے جائے رفتگاں باقی

گل اشک چشم لالۂ داغ دل سنبل پریشانی
یہی اب رہ گئی ہے یادگار گلستاں باقی

مدد اے جذبۂ فیض خدا اے برتر و دانا
کہ ہے اس دورِ حجت میں یقین رخصت گماں باقی

د۔ آتش

ترا در چھوڑ کر یارب بتا جائے کہاں مسلم ۔۔۔ کہ ہے اللہ والوں کا یہی اک آستاں باقی
تو اکرم ہے کریموں میں تو ارحم ہو رحیموں مین ۔۔۔ تو ہی اک بیکسی مین ہے نصیر بیکساں باقی
شفیع عاجزاں ہے تو غفور عاصیاں ہو تو ۔۔۔ تو ہی بس بیبسی مین ہے رفیق بے کساں باقی
سہارا تیری رافت پر بھروسہ تیری رحمت پر ۔۔۔ کرم پر ہے ترے تکیہ محبین و مسلماں باقی

ترا ارشاد ہے مولیٰ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ
رہے گا کب تلک محزون نفیس خستہ جاں باقی

خاکسار۔ الف دین نفیس

نظم کے ختم ہونے کے بعد جناب مولوی محمد اکرام خان صاحب ریٹائرڈ جج وپریسیڈنٹ اسلامیہ اسکول پونچھ نے ایک مختصر تقریر فرمائی جو حسب ذیل ہے ۔

میرے مکرم دوست پیر حسام الدین شاہ صاحب سجادہ نشین پونچھ نے آیۃ شریف ھَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ کی تعمیل کی ہے جس کا کرنا ہم پر واجب تھا یعنی اسوقت تک جس قدر رعائتیں یا عطیات ہمیں ملے ہین اُن کا شکریہ مناسب ہو جو کیا گیا لیکن حضرات اس سے کہیں یہ نہ سمجھ جاوین کہ بس اسی مین ہمارے اغراض ومقاصد پورے ہوگئے ہین۔ نہیں ہرگز نہیں تمہاری آرزوئین بہت بچی ہین تمہاری ضروریات تعلیمی بہت وسیع ہین۔ انٹرمیڈیٹ ڈیپارٹمنٹ جاری کرنے کے لئے بڑے روپیہ کی ضرورت ہے جس قدر زیادہ روپیہ کی ضرورت ہو اسی قدر ہم باشندگان ریاست پونچھ زیادہ افلاس زدہ ہین۔ اس لئے مین مودبانہ طور پر اس عظیم الشان کانفرنس کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہون کہ پونچھ بھی کشمیر سے ملحق ہو یہان تک کہ خط وکتابت مین بھی پونچھ کشمیر لکھا جاتا ہو پس جہان کہ کانفرنس مین کشمیری مسلمانان کی اصلاح کا ذکر آوے ہان بھی پونچھ کو بھی الحاق اور منسلک کرنے کا رتبہ بخشا جاوے تاکہ اکابرین کانفرنس کو علیحدہ تکلیف گوارا نہ کرنی پڑے اور ساتھ ہی مین تحریک کرتا ہون کہ براہ عنایت کانفرنس سے حضور سری راجہ صاحب بہادر پونچھ اور جناب کپتان سی۔ ایف میکنزی صاحب بہادر اسپیشل اسسٹنٹ رزیڈنٹ اور جناب پنڈت جنار دھن صاحب وزیر ریاست کو خطوط لکھے جاوین اور ساتھ ہی آئیندہ مسلمانان پونچھ کی تعلیمی ترقی کے لئے یہی تحریک فرمائی جاوے تاکہ سلسلہ جلدی ہو جاوے ۔

چند رزولیوشن کی اہمیت کیوجہ سے پروگرام مطبوعہ مین کسیقدر فرق کیا گیا اور اول دو رزولیوشن پیش ہوئے جو پروگرام کے آخر مین درج تھے چنانچہ وہ رزولیوشن ذیل باتفاق پاس ہوئے

رزولیوشن نمبر (۲۹) مسلمانان کشمیر

ریاست کشمیر کے مسلمانون کی تعلیمی ترقی کے لئے ضروری ہو کر وہان کے سررشتۂ تعلیم مین مسلمانون کی کافی تعداد ہو اس لئے یہ کانفرنس حضور مہاراجہ صاحب بہادر ریاست کشمیر سے بادب مستدعی ہے کہ جس طرح دیگر اقوام کے طلبہ کو وظیفہ دیکر ٹرننگ کالجون کی تعلیم کے لئے بھیجا جاتا ہے مسلمان طلبہ کو بھی وظیفہ دے کر ٹرننگ کالجون مین داخل کرایا جاوے ۔

رزولیوشن نمبر (۳۰)

اس کانفرنس کی رائے مین مسلمانان صوبۂ سرحدی و صوبۂ پنجاب کی تعلیمی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح ممالک متحدہ کی گورنمنٹ نے اپنے رزولیوشن محررہ ۲۵ اگست ۱۹۱۳ء کے ذریعہ سے ہر ضلع مین اُس ضلع کے مسلمانون کی تعلیم کی نگرانی کے لئے مسلمان ممبرون کی کمیٹیان افسر ضلع کے زیر صدارت قایم کیے جانے کی تحریک کی ہو اسی طرح ان ہر دو صوبجات کے اضلاع مین کمیٹیان قایم ہون ۔

رزولیوشن نمبر (۳۱)

یہ کانفرنس گورنمنٹ ہند سے بادب التجا کرتی ہے کہ جو رقوم کثیر ان مسلمانون کے منافع سود کے سیونگ بنکون مین جمع ہین جو سود لینا نہین چاہتے وہ اس کانفرنس کو عطا فرمائی جاوین اور اُن سے یونیورسٹی کے متعلق ایک ہوسٹل مسلمانون کیواسطے قایم کیا جاوے اور جو آمدنی اُس ہوسٹل سے ہو وہ مسلمان طلبہ کے وظائف مین صرف کیجاوے ۔ رزولیوشن نمبر ۳۲ واپس لیا گیا اور نمبر (۳۳) ترک کیا گیا

بعد اس کارروائی کے مولانا شاہ سلیمان اشرف صاحب واعظ مدرسۃ العلوم علیگڑھ نے جو خاص بغرض شرکت کانفرنس تشریف لائے تھے وعظ فرمایا ۔

وعظ[1]

جناب مولٰنا سید سلیمان اشرف صاحب

بموقع

اجلاس بست و ہشتم آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

خطبۂ مسنونہ وصلوٰۃ تحفہا تعوذ و تسمیہ کے بعد یہ آیت کریمہ تلاوت کی گئی۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝

بشارتِ فتح مبین

یہ آیہ کریمہ آخر رکوع سورۂ فتح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی ایک جماعت ہے جو حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں سعادتِ کونین کی دولت لوٹتی ہوئی مدینہ طیبہ واپس جارہی ہے۔ بغرض عمرہ رسول کریم علیہ الوف الصلوٰۃ والتسلیم چودہ سو مسلمانوں کو لیکر عازم مکہ معظمہ ہوئے تھے۔ کفار مزاحم ہوئے اور حدیبیہ سے آگے بڑھنا نہ ہوا۔ گو یہ واقعہ طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھیئے کہ ایک صلح نامہ لکھا گیا جس کے شرائط مسلمانوں پر شاق تھے۔ لیکن سرکار دو عالم کی متابعت اسی میں تھی لہٰذا بسر و چشم منظور تھا۔ مگر اس طرح کی مراجعت نے دلوں کو اس کیفیت کو جس میں ایک سوزش اس سوزش میں اخلاص اس اخلاص میں عبودیت کامل موجود تھی ذرا چمکا دیا تھا۔ اس پر منافقین کے استہزا و طعن و تشنیع اور بھی نمک چھڑکتے جاتے تھے۔ پس بکمال نیازمندی، انتہائے تذلل و انکسار سے قلوبِ مومنین

---

[1] یہ "وعظ" آپ کتاب ہٰذا کے صفحات ۱۸۱ تا ۱۲۴ پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

اجلاس ہشتم

منعقدہ

یوم سہ شنبہ بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء وقت شب ۸ بجے سے دس بجے تک

زیر صدارت عالی جناب خان بہادر مولوی رحیم بخش صاحب سی۔ آئی۔ ای

سب سے پہلے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے رزولیوشن نمبر ۳۵ کی تحریک کی اور کہا کہ میں مندرجہ ذیل حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان صاحبان نے قومی تعلیم میں دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ علی الاعلان اس کا اعتراف کریں۔ تمام حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور اصحاب ذیل کا شکریہ منظور ہوا۔

رزولیوشن نمبر ۳۵

یہ کانفرنس مندرجہ ذیل اصحاب کا ان کی بیش بہا تعلیمی خدمات کے واسطے شکریہ ادا کرتی ہے۔

صوبہ سرحدی کشمیر و پنجاب

شاہپور۔ نواب کپتان ملک محمد مبارز خاں صاحب۔ ٹوانہ رئیس اعظم۔

گجرات ۔ خان صاحب چودہری فضل علی خان صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ۔

منشی محمد دین صاحب پلیڈر سکرٹری لوکل کمیٹی۔

جہلم ۔ مولوی محمد اکرم صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ سکرٹری انجمن معین تعلیم جہلم

راولپنڈی۔ قاضی سراج الدین احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا۔

رپورٹ متعلق اجلاس بست و ہشتم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۱۴ء کا صفحہ ۳۴۶

پنڈت جواہر لال نہرو مدح سرسید میں

تحریک کی تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بھی محسوس ہوا کہ سرسید اور ان کے رفقاء پر بسا اوقات ان کی برطانوی حکومت سے وفاداری اور تحریک آزادی سے علاحدگی کے باعث تنقید کی جاتی ہے۔ اس تنقید کے محرکات یا تو سیاسی اور بعض دوسرے رجحانات ہیں یا اس کی وجہ تاریخی حقائق تک ناکافی رسائی ہوتی ہے۔ یہ اپنی جگہ سچ ہے کہ کانفرنس کے قائدین نے شروع میں حکومت سے تعاون پر زور دیا کیوں کہ ان حالات میں یہ ناگزیر تھا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مسلمانوں کو ہر قیمت پر ایک پس ماندہ اور غیر موثر اقلیت میں تبدیل ہو جانے سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں ایک جگہ سرسید اور ان کی تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سرسید نے اپنی پوری قوت جدید تعلیم کی طرف مرکوز کردی تھی اور اپنی قوم کو کسی دوسری طرف متوجہ ہونے دینا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ یہ ایک دشوار کام تھا اور مسلمانوں کی ہچکچاہٹ دور کرنا مشکل تھا۔ سرسید کا فیصلہ کہ مسلمانوں کی ساری توجہ مغربی تعلیم حاصل کرنے پر صرف کردی جائے بلاشبہ درست تھا۔ اس کے بغیر وہ جدید ہندوستان کی تعمیر میں کوئی موثر رول ادا نہیں کر سکتے تھے۔''

(آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال مرتبہ امان اللہ خاں شیروانی، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۴)

پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی دیگر کتب

ادارۂ پاکستان شناسی لاہور